ڈاکٹر زور

پروفیسر سیدہ جعفر

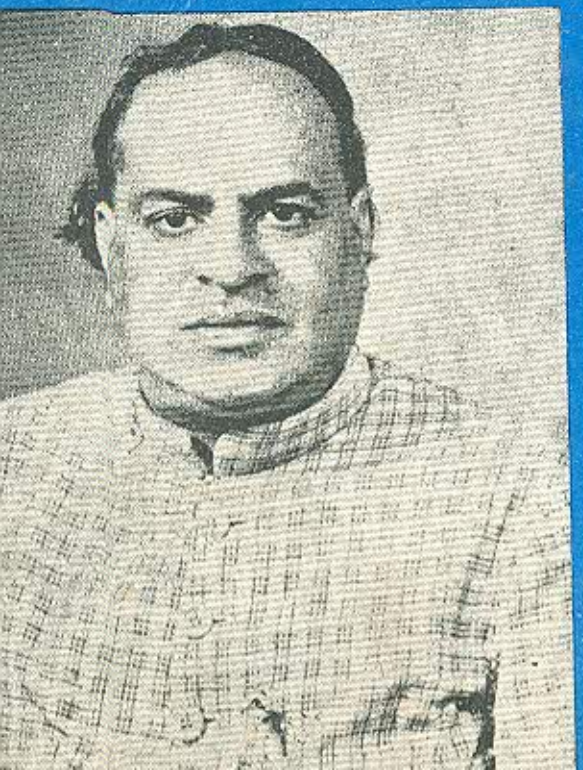

ہندستانی ادب کے معمار

نامور محقق، عالم لسانیات وصوتیات، اور ماہر دکنیات کی حیثیت سے ڈاکٹر زورؔ کا نام تاریخ ادب اردو میں تابندہ رہیگا۔ ڈاکٹر زورؔ کی متنوع دلچسپیوں کا کچھ اندازہ ان کی تصانیف کے رنگارنگ موضوعات سے ہوتا ہے۔ "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ"، "گولکنڈے کے ہیرے"، "سرگزشتِ حاتم"، "ہندوستانی لسانیات"، "روحِ تنقید" اور "اردو شہ پارے" ان کی وقیع ادبی کاوشیں ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر زورؔ نے شاعری بھی کی، افسانے بھی لکھے، اور خطوط بھی لیکن ان کی تخلیقی شخصیت کی سب سے اہم پہچان ان کی تاریخی بصیرت اور تدوینِ متن کا سلیقہ ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر زورؔ کی زندگی اور شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مختلف ابواب میں ڈاکٹر زورؔ کی لسانی خدمات، افسانہ نویسی، تنقید نگاری اور تحقیقی مساعی وغیرہ کا تجزیہ کرکے ان کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اردو سے اپنی بے پناہ محبت کے نقش صفحۂ قرطاس ہی پر نہیں چھوڑے بلکہ سنگ وخشت کی ایک دلکش عمارت "ایوان اردو" بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے، کتاب میں اس پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

چونکہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ذاتی طور پر ڈاکٹر زورؔ سے واقف تھیں اس لیے انھوں نے ڈاکٹر زورؔ کی علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سیدہ جعفر کی کوئی درجن بھر تنقیدی اور تحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں، یہ ان کا پہلا سوانحی کارنامہ ہے۔

SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 15-00

ہندوستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر زور

پروفیسر سیدہ جعفر

ساہتیہ اکادمی

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

Dr. Zore : A monograph by Syeda Jaffer on the Urdu author. Sahitya Akademi, New De
SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 15-00

© ساہتیہ اکادمی

پہلی بار ۱۹۸۴ء
دوسری بار ۱۹۹۰ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :
رویندر بھون، ۳۵ فیروزشاہ مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیل ڈیپارٹمنٹ
'سواتی' مندر مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفتر
جیون تارا بلڈنگ، ۲۳A/۴۴X ڈائمنڈ ہاربر روڈ
کلکتہ ۷۰۰۰۵۳
SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 15-00
۲۹ ایلڈامس روڈ، نیام پیٹ مدراس - ۶۰۰۰۱۸
۱۷۲، بمبئی مراٹھی گرانتھ میوزیم مارگ دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

قیمت : دس روپے

مطبع: ڈیسنٹ آفسیٹ ۷۳-۸ نرائنا فیز I نئی دہلی ۱۱۰۰۲۸

فہرست

حالات زندگی	۹	۱۸
شخصیت	۱۹	۳۵
ادارہ ادبیات اُردو	۳۶	۴۶
تحقیق و تدوین	۴۷	۹۵
تنقید	۹۶	۱۱۶
صوتیات و لسانیات	۱۱۷	۱۲۸
افسانہ نگاری	۱۲۹	۱۵۲
شاعری	۱۵۳	۱۵۹
متفرقات	۱۶۰	۱۷۲

حالاتِ زندگی

جامعہ عثمانیہ کو اپنے جن نامور فرزندوں پر ناز ہے اُن میں سے ایک ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ بھی ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ دکنی تہذیب اور دکنی زبان و ادب کے سب سے بڑے رسیا تھے۔ سرزمین دکن سے انھیں والہانہ وابستگی تھی۔ انھوں نے اس کی روایات کے گن گائے اور اس چمن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی۔ دکن کے ایک ایک ذرّے سے انھیں محبت تھی اور وہ اس کی معمولی سے معمولی روایت کا بھی احترام کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ دکن کے سب ہی قدیم شاعروں اور ادیبوں کے اکتسابات منظرِ عام پر آجائیں اور اس مقصد کی لگن میں انھوں نے تاریخ ادب اُردو کے ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے بہت سے فنکاروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا اور بھولی بسری یادوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا اور بہت سے ہیرے جو صدیوں کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئے تھے ڈھونڈ نکالے۔ وہ صرف ایک محقق، ماہر لسانیات، اور ادیب اور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اُن میں غیر معمولی عملی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ ایک شخصِ واحد کی ذات میں علم و عمل کا ایسا حیرت انگیز امتزاج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ میں حیدرآباد کے محلّے شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت زعم کے ایک غیر مطبوعہ روزنامچے سے پتہ چلتا ہے کہ محدث عبدالوہاب نقشبندی کے حکم سے جو اُن کے استاد اور پیرِ طریقت تھے، ڈاکٹر زورؔ کا

نام سید محی الدین رکھا گیا تھا اور نومولود کو دیکھ کر عبدالوہاب نے کہا تھا کہ اس لڑکے کی پیشانی پر "علایم عظمت" پائے جاتے ہیں۔ یہ لڑکا خاندان کا نام روشن کرے گا۔ ڈاکٹر زور کا سلسلۂ نسب قطب الاقطاب سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ سید ابراہیم سپہ سالار تغلقی دور میں وارد دکن ہوئے تھے اور ناندیڑ کے قریب قندھار دکن میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ آج بھی قندھار دکن میں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔ سید ابراہیم نظام الدین اولیاء کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے تھے اور نظام الدین اولیا ہی نے سید ابراہیم کو "شیخ" کا لقب عطا کیا تھا۔ سید ابراہیم کی اولاد میں بہت سے صاحبانِ مسندِ ارشاد گذرے ہیں۔ ان میں سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان، سید شاہ برہان الدین، شاہ جلال الدین رفاعی اور بدیع الدین رفاعی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ صاحبِ عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہید کی سوانح حیات "روضۃ الشہدا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ صاحب عالم ڈاکٹر زور کے حقیقی دادا تھے اور یکم رمضان ۱۳۲۶ھ میں طغیانی رود موسیٰ میں وفات پائی تھی۔ ان کے تمام اہل و عیال اس سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن ڈاکٹر زور کے والد سید غلام محمد شاہ صاحب قادری پر بھی گئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اس دریا برد خاندان کے واحد چشم و چراغ رہ گئے تھے۔ غلام محمد قادری الرفاعی صحیح معنیٰ میں مشائخ خاندان کے فرد تھے انھوں نے اپنے سلسلے کی پیری مریدی کی روایات کو بھی برقرار رکھا تھا اور تبلیغی مساعی میں بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اپنے آبائی وطن بیدر کے مختلف محلوں میں اکثر ان کا وعظ ہوا کرتا تھا جس میں ان کے سینکڑوں معتقدین اور حلقہ ارادت کے افراد شرکت کرتے۔ غلام محمد قادری شاعر تھے اور زعم تخلص کرتے تھے اور ایک زاہد پاکباز، نیک طینت اور صوفی منش انسان تھے۔ دیہاتی عوام کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کو انھوں نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا اور تمام زندگی ان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف رہے۔ ان کا

انتقال ۱۳۶۱ھ میں ہوا۔

ڈاکٹر زور نے گھر پر والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی والدہ بشیر النساء بیگم فضیلت جنگ کی رشتہ دار تھیں۔ فضیلت جنگ، حیدر آباد کے چھٹے حکمران میر محبوب علی خان آصف سادس کے دور میں سررشتہ امور مذہبی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ڈاکٹر زور کی دادھیال اور ننھیال دونوں مشائخین کے گھرانے تھے۔ ڈاکٹر زور کے پرنانا بودھن (کاغذ نگر) ضلع نظام آباد کے نامور خطیب اور متقی بزرگ تھے اور انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ڈاکٹر زور کا خاندان علم و فضل سے بہرہ مند تھا۔ ان کے نانا محمد وقار الدین کا شمار اپنے وقت کے جید عالموں میں ہوتا تھا اور وہ بھی صاحب تصنیف تھے۔ محمد وقار الدین کا تحریر کردہ "چار گلزار" کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے۔ محمد وقار الدین کے والد محمد محسن بھی ادیب و شاعر تھے۔ ان کی فارسی تصنیف "گلدستۂ محسنی" جو ۱۲۶۹ھ میں نواب شمس الامراء کی فرمایش پر لکھی گئی تھی، ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر زور نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جو علم و ادب کے چرچوں سے گونج رہا تھا اور جس میں خدا پرستی، دینداری اور انسان دوستی مقصد حیات سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر زور کی ابتدائی تعلیم "مدرسہ دارالعلوم" میں ہوئی اور اس کے بعد "سٹی ہائی اسکول" اور پھر "عثمانیہ کالج" میں وہ زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۲۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۹۲۷ء میں ایم اے کے امتحان میں اول آئے۔ ایم اے میں اعزازی کامیابی حاصل کرنے پر حکومتِ حیدر آباد نے آپ کو سرکاری وظیفے پر اگست ۱۹۲۷ء میں انگلستان بھیجا۔ ڈاکٹر زور ۳۱ اگست ۱۹۲۷ء کو اطالوی جہاز "کرکویا" سے روانہ ہوئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ان کا مقالہ اُردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق تھا جسے بہت سراہا گیا تھا۔ لسانیاتی تحقیقات کے سلسلے میں ابتدائی سنسکرت اور لسانیات کی تعلیم پروفیسر ٹرنر سے اور صوتیات

کی تعلیم پروفیسر اے لائیڈ جیمس سے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز" لندن میں حاصل کی۔ انگلستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر زور ۱۹۳۰ء میں پیرس پہنچے تھے صوتیات اور فونٹکس (Phonetics) کی تحصیل کے لیے یونیورسٹی کالج میں پروفیسر ڈینیل جونس اور مس لی لیاس اور ای آرمسٹرانگ کے شاگرد رہے۔ ۱۹۳۰ء میں صوتیات پر تحقیقی مقالہ "ہندوستانی فونٹکس" (Hindustani Phonetics) لے انسٹی ٹیوٹ دی فونیٹک میں مکمل کیا اس کے بعد سوربون یونیورسٹی پیرس میں گجراتی پر پروفیسر جے بلوک کی نگرانی میں کام شروع کردیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جینوا سے روم پہنچے۔ روم کے "نیپلس فیلس" سے ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو جہاز اورنٹس (Orints) میں سوار ہوئے اور ۲۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے مدراس کا سفر کیا اور پھر وہاں سے سیدھے حیدرآباد چلے آئے اور اس طرح ان کا علمی سفر ختم ہوا۔ جب ڈاکٹر زور یورپ سے حیدرآباد آئے تو یہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی جگہ خالی تھی۔ ڈاکٹر زور کو ان کی علمی صلاحیتوں اور قابلیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ریڈر کی حیثیت سے مامور کیا۔ ۱۹۵۰ء میں "دارالعلوم" اور "چادرگھاٹ کالج" کا انضمام عمل میں آیا اور بحیثیت پرنسپل ان کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر زور چادرگھاٹ کالج ہی سے ۱۹۶۰ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ حکومت ہند کی طرف سے ڈاکٹر زور ساہتیہ اکیڈیمی کے رکن نامزد کیے گئے تھے اور رسالہ "آجکل" دہلی سے بھی وابستہ تھے۔ کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ڈین کی حیثیت سے ڈاکٹر زور کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو ان کے قلب پر حملہ ہوا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ کشمیر کے ماہر ڈاکٹروں نے علاج کیا لیکن بے سود۔ ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات انھوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ڈاکٹر زور نے خانقاہ عنایت الٰہی میں جو حیدرآباد کے محلے پرانا پل میں واقع ہے، اپنے لیے

قبر تیار کروائی تھی لیکن کشمیر میں پیوند خاک ہوئے اور سے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

دوسرے دن ان کے سانحۂ رحلت کی خبر سنتے ہی ریاست کے کئی وزراء اور سربرآوردہ شخصیتیں ان کی کوٹھی پر تعزیت کے لیے جمع ہوگئیں۔ دن کے بارہ بجے ان کی میت اٹھائی گئی۔ تجہیز و تکفین کا انتظام ڈپٹی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی نے کیا تھا دوپہر کے وقت دکن کی اس مایۂ ناز ہستی کو کشمیر میں سپرد خاک کیا گیا اور محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آصف سابع میر عثمان علی خان تک کے حیدرآباد کا ایک پرستار اور اردو کا ایک مجاہد وادیٔ کشمیر میں ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈاکٹر زور کا جنازہ جس دھوم دھام سے اٹھا اور جلوس جنازہ میں لوگوں نے جس انداز سے شرکت کی تھی اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا جسد خاکی ایک کھلی ٹرک پر رکھا گیا تھا اور پیچھے ۳۵ موٹر کاریں تھیں۔

ڈاکٹر زور کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ کشمیر میں اردو کی ترقی کے وسائل ناکافی نہیں اور مستقبل میں یہاں اردو کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب وہ کشمیر آئے تو نئے منصوبوں کے ساتھ انھوں نے اس ارض جنت نشاں پر قدم رکھا تھا۔ ڈاکٹر زور کی سرخروئی اور کامرانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان میں اعلیٰ تنظیمی صلاحیتیں موجود تھیں اور قدرت نے انھیں سلجھا ہوا ذہن اور "نگاہ بلند" اور "سخن دلنواز" عطا کیا تھا اس لیے وہ بہت جلد ہر جگہ اپنے چاہنے والوں اور مخلصین کا ایک حلقہ پیدا کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے کشمیر آ کر یہاں کی تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ تاریخی مقامات کی سیر کی اور یہاں کے قدیم آثار سے دلچسپی لی۔ تاریخ گولکنڈہ ہو، بیجاپور ہو، یا اورنگ آباد کی تاریخ یا کشمیر کے قصہ پارینہ، انھوں نے ماضی کے مطالعے اور اس کی روایات کا ہمیشہ احترام کیا۔ وہ اس تصور کے حامل تھے کہ انسانی فکر کی بنیادیں اپنی تاریخ اور

اپنے تہذیبی ورثے کے تناظر میں استوار ہوتی ہیں کشمیر میں ڈاکٹر زور نے اہل کشمیر کے علمی کارناموں اور فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو غائر نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی اور قدیم وجدید شعراء اور مورخین کے کارناموں کو منصۂ شہود پر اجاگر کرنے کے لیے تحقیق کا آغاز کیا۔ وہ "داستان ادب کشمیر" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور خاصا مواد بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کشمیری زبان سے واقفیت حاصل کریں اور اس کی انھوں نے باضابطہ کوشش شروع کر دی تھی کشمیر میں ڈاکٹر زور کی کوٹھی کے آس پاس مختلف گھروں میں جو کم عمر لڑکیاں اور لڑکے رہا کرتے تھے وہ انھیں اپنے گھر بلاتے اور مٹھائیاں تقسیم کر کے ان سے کشمیری زبان کے کئی فقرے سیکھ لیتے تھے کشمیر کے مشہور شعراء محمود گامی، رسول میر وہاب پرے اور مہجور کے اشعار ترنم میں سننے کے خواہشمند رہتے اور اپنے کشمیری احباب سے بارہا ان کا کلام سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور ایک مخلص اور دردمند انسان تھے۔ دکن میں رہے تو دکن کی سرپرستی میں ہمہ تن مشغول رہے اور کشمیر پہنچے تو کشمیر کی ترقی کی فکر میں شب و روز نئے نئے منصوبے مرتب کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیری ایک پرکشش اور خوبصورت زبان ہے اور تا حال اسے اپنا جائز مقام نہیں مل سکا ہے اور اس کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر زور کا جمالیاتی شعور بہت رچا ہوا تھا اور ہر دلنواز شے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ وہ کشمیر کی جھیلوں، یہاں کے ہوش ربا مناظر اور قدرتی حسن پر فریفتہ تھے۔ اور مغل باغات کی دلاویزی انھیں مسحور کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر زور کا قیام کشمیر میں کم و بیش دو سال رہا۔ یہ قلیل عرصہ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں صرف ہونا چاہیے تھا لیکن اس مختصر سی مدت میں ڈاکٹر زور نے خود کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کر لیا اور یہاں کے احباب کے دلوں میں اپنی جگہ بنا لی۔ انھوں نے کشمیریوں میں

ایک نیا علمی جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا۔ وہ اس سرزمین پر بھی ادارہ ادبیات اردو کی ایک شاخ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے کشمیر کے شعراء، ادباء اور افسانہ نگاروں کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور انھیں اپنی تخلیقات کی اشاعت پر اکسایا۔ وہ انھیں مفید مشورے دیا کرتے اور ان کی دلجوئی و ہمت افزائی کی کوشش کرتے تھے۔ مخمور حسین کے افسانوں کا مجموعہ "نیل کمل مسکائے" انھیں کی دلچسپی اور توجہ سے منظر عام پر آیا تھا۔ یہ مجموعہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کے شعبہ مطبوعات کشمیر کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی اور اس کا دیباچہ تحریر کر کے ڈاکٹر زور نے افسانہ نگار کی خود اعتمادی کو تقویت پہنچائی تھی۔ "نیل کمل مسکائے" کا دیباچہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کشمیر کے افسانوی ادب سے متعلق ضروری معلومات رکھتے تھے اور اس کی تاریخ ان کے پیش نظر تھی چنانچہ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> "اس ملک کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے نام یہاں کی ادبی تاریخ میں سرفہرست رہیں گے پردیسی کے مجموعے "شام و سحر" اور بہتے چراغ اور در کے "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" ظاہر کرتے ہیں کہ ان افسانہ نگاروں نے کشمیر اور اہل کشمیر کی حقیقی زندگی کی جھلکیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف جاگیرداری نظام پر چوٹیں کیں بلکہ فرسودہ سماجی بندشوں کے خلاف بھی آواز بلند کی عوام کی اقتصادی بدحالی کی ان دونوں نے اس طرح ترجمانی کی ہے کہ ان سے افسانوں میں مقصدیت ظاہر ہو گئی ہے یہ دونوں اپنی کہانیوں کے کردار زیادہ تر اہلکوں، مزدوروں اور کسانوں سے لیتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے کشمیر کے رہنے والوں اور کشمیر کی بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی کی عمدہ عکاسی کی ہے"

کشمیر میں ڈاکٹر زور نے صرف افسانہ نگاروں کی نئی نسل کی حوصلہ افزائی کی

بلکہ دوسری اصناف سے تعلق رکھنے والی ادبی شخصیتوں کی بھی پذیرائی کی ہے۔ رسا جاودانی کے کلام پر ڈاکٹر زور کا تبصرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کشمیر کے نوجوانوں سے اچھی توقعات رکھتے تھے جس طرح مخمور حسین کے نیل کمل مکالمے" میں انھوں نے کشمیری افسانہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح رسا جاودانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی کشمیری شعراء کی شعری تخلیقات کا جائزہ لے کر ان کی فنی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کشمیر کے فارسی شعراء کے کلام سے بھی انھیں شغف تھا۔ شعرائے کشمیر میں وہ غنی کاشمیری، جویا کاشمیری نازکی، حامدی، رسا اور شہہ زور کے کلام کے مداح تھے۔ یہاں ڈاکٹر زور کا ایک لطیفہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ قیام کشمیر کے زمانے میں جب بھی موقعہ ملتا وہ حیدرآباد چلے آتے تھے۔ ایک دن پتہ چلا کہ زور کشمیر سے آئے ہوئے ہیں۔ جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے دولت خانے پر پہنچی تو دیکھا کہ ڈاکٹر زور کا دیوان خانہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور اپنے مخصوص شگفتہ دکنی لب و لہجے میں کہنے لگے:

"میں ابھی ان لوگوں کو سنا رہا تھا کہ کشمیر جانے پر پتہ چلا کہ ایک کشمیری شاعر کا تخلص شہہ زور ہے"

پھر ہنس کر کہنے لگے "ہر زور راشہ زور کبھی نہیں سنا تھا"۔

کشمیر کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تھی اس لیے ڈاکٹر زور کی تمنا تھی کہ یہاں کے اہل قلم حضرات زبان کی اس حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں وہ اپنے قیام کشمیر کے زمانے میں ان کی ہر ممکنہ طریقے پر رہبری اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ انھوں نے قاضی غلام محمد کے مجموعۂ کلام "حرف شیریں" پر بھی اپنی رائے ظاہر کی تھی اور ان کے سنجیدہ مزاح کو بہت سراہا تھا۔ ڈاکٹر زور کی خواہش تھی کہ

کشمیر میں شائع ہونے والی کتابیں ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچیں تاکہ یہاں کے فنکاروں سے ہندوستان کے دوسرے خطوں کے شعرا اور ادیب بھی متعارف ہو سکیں۔ ڈاکٹر زور کا قیام کشمیر یونیورسٹی طلبا کے لیے بھی ایک فال نیک ثابت ہوا۔ انھوں نے طلبا کے دل و دماغ کو اپنی شخصیت سے مسحور کر لیا تھا۔ وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پی ایچ ڈی کا نصاب شروع کروانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اردو کے موجودہ نصاب میں بھی بہت سی خوشگوار اور اہم تبدیلیاں کیں۔ ڈاکٹر زور کی کوششوں کی بدولت ایم، اے کے طلبا کے لیے فارسی اور سنسکرت پڑھانے کا بندوبست ہوا۔ "مطبوعات کشمیر" کے سلسلے کا آغاز بھی آپ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے جس کا مقصد کشمیری فنکاروں کی تخلیقات کو زیور طبع سے آراستہ کر کے انھیں منظر عام پر لانا تھا۔ سری نگر کے قیام کے دوران انھوں نے یہاں کے علم و ادب کی اشاعت و ترقی کے لیے ایک ہمہ گیر اسکیم تیار کر لی تھی اور اسے "اردو اکاڈیمی" سے موسوم کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کشمیر کے قدیم فنکاروں اور ان کے ادبی اکتسابات پر تحقیقی کام کا سلسلہ شروع کرنے کے خواہشمند تھے لیکن بعض ناگزیر حالات کی بنا پر وہ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کشمیر میں پہلے ہی سے "کلچرل اکیڈیمی" موجود تھی جس کا دائرہ عمل خاصا وسیع تھا اور ڈاکٹر زور کو اس اکیڈیمی کا ممبر نامزد بھی کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زور اس کی ادبی نشستوں میں شریک رہتے اور اپنے مفید مشوروں سے اکاڈیمی کے کام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اکیڈیمی میں جب کشمیری اردو ڈکشنری مرتب کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مختلف ممبروں نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں لیکن، کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر زور نے مشورہ دیا تھا کہ گریرسن کی مرتب کردہ رومن رسم الخط والی ڈکشنری کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں خطوط پر کام کیا جائے اور نئے الفاظ کی فہرست علیحدہ طور پر مرتب کر کے شائع کی جائے اور اس طرح کشمیری

اردو لغت کا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے ان ہی کے مجوزہ خطوط پر ڈکشنری کی تیاری عمل میں آرہی ہے۔ ڈاکٹر زور میں غیر معمولی علمی صلاحیتیں موجود تھیں۔ عمر کے آخری ایام میں بھی جب غالب کے الفاظ میں "قویٰ مضمحل" ہونے لگے ہیں۔ ڈاکٹر زور ایک باعمل اور حرکی شخصیت رہے۔ وہ ادب کی خدمت کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ تمام زندگی علم و ادب کی ترقی کے منصوبے اور اسکیمیں بناتے اور انھیں عملی شکل دیتے رہے۔ وہ خود ادب کی خدمت کرتے اور یہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اسے اپنا مقصد حیات بنالیں۔

ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور سنڈیکیٹ کے رکن کی حیثیت سے بھی وہ کشمیریوں میں خاصے مقبول رہے اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ علمی اور ادبی معاملات میں لوگوں کی مدد کرتے رہے۔

شخصیت

حیدرآباد نے ڈاکٹر زور جیسے اُردو کے شیدائی بہت کم پیدا کیے ہیں۔ اُردو کی بقاء و ترویج کے لیے علمی خدمت کے ساتھ ساتھ عملی کام کرنے میں مولوی عبدالحق کے سوا کوئی ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر زور کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف دکن اور جنوبی ہند بلکہ پورے برصغیر کو اپنے فیضانِ علم سے مستفید ہونے کا موقعہ عطا کیا۔ ڈاکٹر زور کا یہ کارنامہ بھی کچھ اہم نہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اُردو کے فدائیوں کی ایک جماعت پیدا کردی تاکہ ان کے بعد بھی اردو تحریک آگے بڑھتی رہے۔

بارعب اور سرخ و سفید چہرہ، بھاری بھرکم جسم، ہونٹوں پر پان کی سرخی، پاٹ دار آواز، تیز آنکھیں جن سے ذہانت ٹپکتی تھی، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، پاؤں میں سلیم شاہی اکثر زیب تن کرتے، چیک کے ڈیزائن کی شیروانی اور ڈھیلا پاجامہ اور سر پر شیروانی کے کپڑے سے تیار کی ہوئی ٹوپی، لبوں پر مسکراہٹ، گفتگو کے درمیان قہقہے لگاتے اور غصے میں چیخنے لگتے۔ یہ تھے ڈاکٹر زور۔ انھیں خاندان کی طرف سے مرشد بننے کا حق تھا اور سسرال کی طرف سے نواب بننے کا، لیکن وہ نہ مرشد بنے اور نہ نواب بلکہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بانی و محرک اُردو کے سچے خدمت گذار اور دکنی ادب کے پرستار بنے۔ احتشام حسین کے الفاظ میں ڈاکٹر زور کا سب سے بڑا کام

دکنی ادب اور تاریخ کو عملی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر دل عزیز بنانا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پیشرو بھی تھے لیکن ڈاکٹر زور نے منظم طور پر اسی کام کو اپنا مشن بنالیا۔ دکنی ادب گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا انھیں اس سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ اس کی کسی کمزوری یا کوتاہی کو تسلیم کرنے پر بڑی مشکل سے تیار ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا کہ انھیں وجہی، غواصی، نصرتی اور خاص طور پر محمد قلی قطب شاہ کے بلامبالغہ سینکڑوں شعر یاد تھے۔ شعر بہت سے لوگوں کو حفظ ہوتے ہیں۔ لیکن نثر کے مسلسل کئی پیراگراف، مخطوطات کے نمبر اور ان کی الماریاں یاد رکھنا غیر معمولی حافظے ہی کا اعجاز ہے۔ ایک دفعہ مجھے "گیان سروپ" کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی اور میں نے زور صاحب سے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے کہا "اوپر کے برآمدے میں جو گادریج کی نئی الماریاں رکھی ہیں ان میں آخری الماری کے تیسرے خانے میں دائیں ہاتھ کی طرف یہ مخطوطہ ملے گا" دوسرے دن میں نے "گیان سروپ" اسی مقام سے نکالی جس کا پتہ ڈاکٹر زور نے بتایا تھا۔

ڈاکٹر زور بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر شخص تھے وہ صحیح معنیٰ میں ایک ایسے "موحد" تھے جن کا کیش ترک رسوم تھا۔ تمام مذاہب کے پیروان کی نظر میں برابر تھے یہ وسعت نظر اور روشن خیالی شاید انھیں اپنے خاندان سے بھی ورثے میں ملی تھی کیونکہ صوفی کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کیں
آخرش دونوں کا سنگم ہوگیا (سراج اورنگ آبادی)

ڈاکٹر زور کے پیام تعزیت میں حیدر آباد کی ایک سربرآوردہ سیاسی شخصیت نے صحیح کہا تھا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ منا کر زور صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر زور ہر مذہب کی تقریبوں میں شریک ہوتے

اور ان سے دلچسپی لیتے تھے جو لوگ مذہب کی حقیقی روح کو پالیتے ہیں ان کے دل میں تنگ نظری اور تعصب کے جذبات کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ان کے دل دوستی اور خلوص کے جذبات سے لبریز ہوتے ہیں ؎

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست

مختصر یہ کہ ڈاکٹر زور "بندہ عشق" تھے اور ترک نسب" کر چکے تھے، ہندو مسلم، پارسی عیسائی ہر مذہب کے ماننے والوں سے ان کے قریبی اور انتہائی خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ کسی مخصوص سیاسی مسلک سے بھی وابستہ نہیں رہے۔ ڈاکٹر زور کے دوستوں، ملنے جلنے والوں، شناساؤں اور عقیدت مندوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا اس میں عمائدین سلطنت، صحافی، قائدین ملت، منجم، انجینیر، آرٹسٹ، حکیم، یونیورسٹی کے اساتذہ، شاعر، مؤرخ، علماء، صوفی، پنڈت، رند مشرب، ڈاکٹر اور نہ جانے زندگی کے کتنے مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ "پہلوان" ان کا ملازم خاص تھا جس کو ڈاکٹر زور کے مزاج میں خاصا دخل تھا۔ ڈاکٹر زور کو اپنے صوفیانہ گھرانے سے بھی انسان دوستی کی روایت ورثے میں ملی تھی۔ وہ سینہ بے کینہ رکھتے تھے اور رواداری و اخلاص و مروت کا پیکر تھے بانی شہر حیدر آباد محمد قلی قطب شاہ سے ان کے جذباتی لگاؤ کا ایک سبب وہ رواداری، قومی یکجہتی اور ہندستان کے مشترکہ تہذیبی سرمایے سے ذہنی وابستگی بھی تھی جو محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کا امتیازی وصف تھا۔

شام کے وقت ڈاکٹر زور کا دیوان خانہ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور خدمت گزاروں کا مسکن بن جاتا۔ بیرون ریاست کی علم دوست شخصیتیں حیدر آباد آتیں، تو ڈاکٹر زور سے شرف ملاقات حاصل کیے بغیر اور ادارہ دیکھے بغیر نامپلی اسٹیشن کا رخ نہ کرتیں۔

کرتیں۔ ڈاکٹر زور کے دیوان خانے کو رونق بخشنے والے نامور شاعر و ادیب ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ہونہار شخصیتیں بھی یہاں موجود ہوتیں جنھیں ڈاکٹر زور کی شفقت و عنایت اور حوصلہ افزائی کا شرف حاصل تھا۔ جب وہ ان محفلوں سے اُٹھتے تو علم و ادب کے جوہروں سے ان کا دامن بھرا ہوتا اور وہ ایک نئی خود اعتمادی، کام کی لگن اور جوش و خروش کے جذبہ سے سرشار ہوتے۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"نیاز فتح پوری، جوش، جگر، قاضی عبدالغفار، حسرت موہانی۔ سر اکبر حیدری نواب چھتاری، علی یاور جنگ، سر رجنی نائیڈو، امجد، علی منظور، علی اکبر صاحب، حسین علی خان صاحب، مجید صدیقی صاحب، سروری صاحب، سید محمد صاحب، ہاشمی صاحب، صمد رضوی ساز، وجد، مخدوم، میکش، غرض ان سب کو دیکھنے ملنے اور سننے کا موقع ملا۔ میں نے حیدر آباد کی ایسی بیٹھکوں میں وہ سب کچھ پایا جو شاید عمر بھر کتابوں کے مطالعہ سے نہ مل سکتا تھا۔ مطالعہ بجائے خود اہمیت نہیں رکھتا ان کو چیز بنانے کے لیے محبت کا فیض بھی ضروری ہے۔"

ڈاکٹر زور بڑے جوہر شناس آدمی تھے وہ دکن کے ہر ذرے کو جوہر اور ہر چنگاری کو شعلہ بنا دینا چاہتے تھے ایک طویل فہرست ان شاعروں اور مصنفین کے ناموں کی ترتیب دی جا سکتی ہے جنھیں ڈاکٹر زور کی ہمت افزائی اور رہبری نے عوام سے روشناس کروایا مگر ڈاکٹر زور کے حلقۂ اثر میں آنے کی شرط یہ تھی کہ انسان پہلے ہی قدم پر مجنوں ہو جائے اور اردو تحریک کا سودا اس کے سر میں ایسا سما جائے کہ پھر کسی اور آرزو کو دل میں جگہ نہ مل سکے۔

ڈاکٹر زور اپنی ذات سے ایک انجمن اور ادارہ تھے وہ اور ان کا مکان رفعت منزل حیدر آبادی کلچر کی نشانیاں تھیں۔ گفتگو کرتے تو خالص دکنی لب و لہجے میں، نشست و برخاست، کھانا پینا، عادات و اطوار، لباس، وضع قطع ہر چیز سے ان کے حیدر آبادی

ہونے کا پتہ چلتا تھا اور وہ اس پر نازاں بھی تھے۔ اگر ڈاکٹر زور کسی احساس کمتری کا شکار ہوتے تو ان اصحاب سے مسابقت میں جنھیں اپنی زبان کے معیاری ہونے پر فخر تھا، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے ۱۸۸۴ء میں ریاست حیدر آباد نے فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کی تھی۔ ریاست حیدر آباد کے مشہور وزیر سالار جنگ نے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے شمال سے قابل اور باصلاحیت افراد کو دکن مدعو کیا اور انھیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کر کے ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال سے جوق در جوق اہل علم اور کم علم سب ہی افراد حیدر آباد کا رخ کرنے لگے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھیں اپنے اہل زبان ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ دکنیوں کی بول چال پر اعتراض کرتے اور ان کے قدیم ادبی سرمایے کی حقیقی قدر و قیمت سے ناواقف تھے۔ اس صورت حال نے حیدر آبادیوں کو ایک طرح کے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جو اُردو ذریعۂ تعلیم کی ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی تھی تو دکنیوں میں خود اعتمادی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے اس احساس کمتری کے خلاف بہاد شروع کر دیا اور دکن کی ثقافت۔ اس کے ادبی سرمایے اور اس کی روایات کے گن گائے اور اس کی عظمت کا احساس دلایا اس کے میر کارواں ڈاکٹر زور تھے، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اہل دکن بھی علم و ادب میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور ان میں بہت سی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں جنھیں بروے کار لانے کی ضرورت ہے۔ دکنیات پر تحقیق کا کام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

ڈاکٹر زور حیدر آباد دکن کی آبرو تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اپنی ایک نظم میں جو انھوں نے اہل حیدر آباد کے لیے لکھی تھی کہا تھا ؎

جہاں شعریت ہے جہاں قدر فن ہے ۔۔۔ جہاں علم و فن کے لیے اک لگن ہے

جہاں کی زمیں رشکِ چرخِ کہن ہے — جہاں ذرّے ذرّے میں مشکِ ختن ہے
جہاں زور وحسرت کا بھی اب وطن ہے — جہاں انجمن واقعی انجمن ہے
جو سچ پوچھتے ہو سخن تو وہ خطّہ — دکن ہے دکن ہے، دکن ہے دکن ہے

ڈاکٹر زور ایک پیدائشی استاد تھے ان کی شخصیت میں بڑا رعب اور بڑی تمکنت تھی۔ صوفی خاندان کی تربیت کا تقدس اور خود ان کی علمیت اور ادبی دیانت داری کے وقار نے ان کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔ وہ ان یادگار زمانہ استادوں میں سے تھے جو طالب علموں کو اپنا علم بانٹنے ہی میں فیاضی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی شخصیت اور کردار کے گہرے نقش بھی ان کے دلوں پر مرتسم کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی بارعب اور پُروقار تھی۔ اعلیٰ سماجی حیثیت اور سیاسی اقتدار رکھنے والے حضرات بھی ان سے برابر کی سطح پر ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑی گونج اور آواز میں ایک خاص طرح کی گرج تھی جو شخص ان سے ملتا وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ایک دفعہ ایوان اردو میں مشاعرہ تھا۔ ہال میں تیس چالیس لوگ جمع ہو چکے تھے ابھی شاعروں کی آمد میں دیر تھی۔ زور صاحب شہ نشین کے عقبی دروازے سے داخل ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔ نیچے بیٹھے ہوئے ایک بذلہ سنج نے برجستہ اپنے ساتھی سے کہا "اُدھر کیا دیکھتے ہو اِدھر دیکھو! اسٹیج پر شیر اُردو ٹہل رہا ہے"

ڈاکٹر زور طبیعت کے سادہ تھے لیکن رہن سہن میں ایک خاص معیار کو ہمیشہ برقرار رکھتے تھے۔ وہ جہاں جاتے بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے اور حیدر آباد سے کشمیر تک اُن کی آن بان باقی رہی۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے یم پانی کر ڈاکٹر زور کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھوں نے ڈاکٹر زور کو "نواب" کا خطاب دیا تھا اور کہا کرتے تھے کہ زور صاحب حیدر آباد کی مٹتی ہوئی تہذیب کی یادگار ہیں۔

ڈاکٹر زور بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے لیکن بزرگوں کا احترام اور تعظیم و ادب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ جذب عالم پوری، حیرت بدایونی اور غلام رسول صاحب کی بڑی عزت کرتے اور جلسوں میں اس کا بطور خاص خیال رکھتے کہ ان کی عمر اور مرتبے کے لحاظ سے نمایاں مقام پر انھیں جگہ دی جائے۔

ڈاکٹر زور ان لوگوں سے بڑی محبت کرتے تھے جو ان کے قریب آجاتے اور اس میں غریب و امیر کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ کشمیر میں ایک چپراسی پیر علی ان کے کام پر مامور تھا ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء کو کشمیر میں اتنی شدید بارش ہوئی کہ پانی خطرے کے نشان کے قریب آگیا۔ لوگ پریشان تھے کہ کہیں سیلاب نہ آجائے۔ کشمیر میں ڈاکٹر زور کے مکان کے پیچھے نالہ چانل واقع تھا۔ وہ بھی پانی سے لبریز ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر زور پانی کا نظارہ کرنے کے لیے اس بند پر پہنچے جہاں سے جہلم بہتا ہے۔ سطح آب میں اضافے کی وجہ سے جزیرے زیر آب ہو گئے تھے۔ یہیں ایک جزیرے میں پیر علی بھی رہتا تھا۔ وہ اس دن کام پر آیا ہی نہ تھا اور ڈاکٹر زور اس کے لیے بڑے متفکر تھے۔ جب انھوں نے کثرتِ آب کا یہ حال دیکھا تو انھیں بڑی پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے دیکھا کہ پیر علی کے مکان کا ایک حصہ زیر آب ہو چکا ہے اور اس پل پر جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا کئی فٹ پانی بہہ رہا ہے۔ ڈاکٹر زور اس منظر کو تھوڑی دیر چپ چاپ دیکھتے رہے پھر پیر علی کو پکارنے لگے اور جب اُسے باہر آتے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی۔ خیریت دریافت کی اور اس سے کہنے لگے تمھیں جس چیز کی ضرورت ہو بتاؤ میں پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ غریبوں کے ایسے ہمدرد اور غمگسار عہدیدار بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر زور ایک محنتی اور باعمل انسان تھے۔ ان کے بچپن کے ایک ساتھی سید محمد اکبر وفاقانی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زور اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے اس خیال کے حامل تھے کہ محض ذہانت و طباعی سے انسان ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتہائی محنت

اور عرق ریزی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کے دوست بہت کم تھے۔ اکبر وفاقانی لکھتے ہیں "زور خودداری، خود اعتمادی اور مسلسل محنت کا مجموعہ تھے" وہ ایک ایک لمحہ کو مصرف میں لانے والے آدمی تھے۔ زندگی بھر روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے رہے ڈاکٹر زور خود انتھک کام کرتے تھے اور مخلص و محنتی افراد کو پسند کرتے تھے، ہڑبونگ مچانے والے، جلسوں کے ذریعہ شہرت حاصل کرنے والے یا سستی ناموری کے خواہاں افراد کو انھوں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ باصلاحیت اشخاص جو اُردو کی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے ان کی خوشنودی حاصل کر سکتے تھے۔ ظاہرداری اور تصنع سے انھیں انتہائی نفرت تھی اس لیے نہ خود کبھی نام و نمود کے لیے کام کیا نہ ایسے اصحاب کی صحبت پسند کی جو ادبی سرگرمیوں کو وسیلۂ تفریح تصور کرتے تھے۔ اُردو کی محبت ان کی دانست میں ایثار اور قربانی چاہتی تھی وہ سمجھتے تھے کہ اس کوچے میں ان افراد کا کام نہیں جو آداب محبت سے ناآشنا ہوں۔ کارہائے نمایاں انجام دے کر دوسروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے کا جذبہ اکثر افراد کے دل میں موجزن رہتا ہے بعض لوگ بے غرض کام کے نام پر اپنی اغراض پوری کر کے نہ صرف دوسروں کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں بلکہ خود بھی اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر زور خود غرضی شہرت طلبی اور خود نمائی یا سستی مقبولیت سے بہت بلند تھے۔ انھوں نے عملی زندگی میں نامساعد حالات سے ٹکر لی اور جہد مسلسل اور کوشش پیہم کو اپنا شعار بنا لیا تھا ڈاکٹر زور نے خواجہ حسن نظامی سے کہا تھا "آجکل کٹیا میں بیٹھنے سے تصوف اور انسانیت کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی" ڈاکٹر زور تمام زندگی ہمہ جہتی عملی کام کرتے رہے اور اپنے بڑے فرزند تقی الدین کو آبائی تکیے کے لیے اپنے بجائے نامزد کیا اور اپنے لیے جد و جہد، مسابقت اور عمل پیہم کی راہ منتخب کی۔ اگر ڈاکٹر زور کو محض عزت و شرف حاصل کرنے کا شوق ہوتا تو وہ اپنے لیے آرام دہ اور پرسکون گوشہ ڈھونڈ لیتے اور

اپنے والد کی گدی نہیں چھوڑتے تھے اور علمی و ادبی مشاغل کی دشوار گذار راہوں پر خانقاہ عنایت الٰہی کے اطمینان بخش ماحول کو ترجیح دیتے تھے لیکن عمر کے کسی حصے میں بھی ڈاکٹر بے عملی اور تعطل کا شکار نہیں رہے بلکہ وہ مجسم عمل تھے ابتدا ہی سے وہ ساری زندگی کا پروگرام مرتب کرتے رہے اور مسلسل کام کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد اپنے تمام منصوبوں کو عملی جامہ پہنا دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ حیات مستعار کا چراغ دفعتاً گل ہو جائے اور لائحۂ عمل نامکمل رہ جائے۔ ڈاکٹر زور کل کا کام آج ہی کر ڈالنا چاہتے تھے حالانکہ بالعموم لوگ آج کا کام کل پر ٹال دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور جس کام کا منصوبہ بنا لیتے اُسے جلد از جلد متشکل دیکھنا چاہتے تھے۔ لندن میں جو نصاب انھیں تین سال میں مکمل کرنا تھا وہ انھوں نے دو سال میں کر لیا تھا۔ اور حیدر آباد چلے آئے تھے اپنے ساتھ جو مواد لے آئے تھے تین مہینے کے انتہائی قلیل عرصے میں اسے "اردو شہ پارے" کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کا شمار دکنی ادب پر لکھی ہوئی مستند و معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ "اُردو شہ پارے" دکنی ادب کی تاریخ میں شہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر زور جلد از جلد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ جس کام کا بیڑا اٹھاتے فوراً اس کی تکمیل میں مصروف ہو جاتے۔ لیت و لعل، تساہل اور آرام طلبی کے الفاظ ان کی لغت میں موجود ہی نہیں تھے۔

ڈاکٹر زور کی زندگی کا موٹو

کار امروز بہ فردا مگذار

تھا اس لیے انھوں نے اپنی زندگی کا ایک دن بھی بیکار نہیں کیا اور زندگی کے ایک ایک لمحے کی قیمت ادا کر دی۔ ڈاکٹر زور بڑی سرعت اور تیزی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے نہ لکھنے کے لیے کسی خاص مقام اور مخصوص ماحول کی ضرورت تھی اور نہ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں کوئی خاص اہتمام کرتے۔ اکثر تجربہ کار مصنف

بھی تصنیف و تالیف کے کام کے لیے پرسکون اور خاموش ماحول کے متلاشی ہوتے ہیں تاکہ پوری توجہ کے ساتھ کام کرسکیں۔ ڈاکٹر زور کا طریقہ کار انوکھا تھا۔ سامنے مخطوطات کھلے ہیں۔ ایک طرف کچھ حوالے کی کتابیں رکھی ہیں، بازو پان کا ڈبہ دھرا ہے، قلم بھی چل رہا ہے۔ ملاقاتیوں سے گفتگو بھی ہو رہی ہے ٹیلیفون پر بات چیت بھی کر رہے ہیں اور پان بھی چباتے جا رہے ہیں۔ ان کے قلم کی روانی میں ملاقاتیوں کی آمد سے خلل پڑتا اور نہ ٹیلیفون ان کے خیالات کے سلسلے کو منقطع کرسکتا تھا۔ آنے والوں کی خیریت دریافت کرتے، رفقاء کار کو ضروری ہدایت دیتے، ملازمین کو کام کرنے کے بارے میں بتاتے اور اس دوران میں دفتر کی مسل پر دستخط بھی کرتے جاتے اور ان کا قلم رکنے نہ پاتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے کمرے میں گاؤتکیے سے لگے بیٹھے ہیں۔ تازہ وارد مخطوطات پر نوٹ بھی لکھتے جاتے ہیں، خطوط کے جواب بھی تحریر کر رہے ہیں اور اپنی تصانیف کی تیاری میں بھی مشغول ہیں یا پروف ریڈنگ کے کام میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر زور کے کام کی رفتار اور انداز کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر زور اچھے کارکن اور اچھے کارفرما تھے۔ کام کرنے کی صلاحیت اور کام لینے کی مہارت دونوں ان میں موجود تھی۔ ان کی مصروفیات میں بڑا تنوع تھا۔ ڈاکٹر زور کو دوسروں کے حسبِ حیثیت کام لینے کا گُر خوب معلوم تھا۔ ہر ادارے اور شعبے میں لوگ کچھ تیز کام کرنے والے ہوتے ہیں، کچھ پھرتیلے نہیں سست رَو ہوتے ہیں۔ بعض نئے کاموں سے گھبرا جاتے ہیں اور کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی محور پر گھومنا پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ان سب سے کام لیتے اور اس طرح کہ کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں ملتا اور ہر شخص حسبِ استعداد اپنی صلاحیتوں کی مناسبت سے کام کرتا اور اس طرح جو کام دوسرے دو دن میں کرتے وہ ڈاکٹر زور اپنے رفقاء اور شرکاء کی مدد سے ایک ہی دن میں کر ڈالتے تھے۔ نئے ریسرچ اسکالرز یا نئے اساتذہ اور مصنفین سے

متعارف ہوتے تو پہلی ہی ملاقات میں تاڑ جاتے کہ ان سے کس نوعیت کے کام میں تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے اور وہ پیرِ تسمہ پا کی طرح اُن کی گردن پر سوار ہو جاتے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اُن کی خود اعتمادی کو مہمیز کرتے اور تصنیف و تالیف یا علمی کاموں میں اعانت و تعاون حاصل کیے بغیر انھیں چھوڑتے نہ تھے۔ خود ڈاکٹر زور میں چونکہ علم و ادب کی خدمت کا شدید جذبہ موجود تھا اس لیے لوگوں پر ان کا مخلصانہ جبر بار نہیں گذرتا تھا اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بہت سوں نے ان کا شریک کار بن کر کام کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ ڈاکٹر زور نے اپنے بعد اُردو کی بقاء و اشاعت کے کام کو آگے بڑھانے اور اُردو تحریک کو زندہ رکھنے والوں کی ایک پوری جماعت کی تربیت کا کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے نوجوان مصنفین کا ایک گروہ تیار کر دیا۔ جس نے ان کے بعد حیدرآباد میں علم و ادب کی شمعیں فروزاں رکھی ہیں۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی اور انھوں نے اردو کی محبت میں ایسے مختلف النوع کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا جن کی تکمیل ایک شخص واحد سے ممکن نہ تھی۔ اس سلسلے میں دوسروں کی توجیہ اور ان کے تعاون کی بھی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر زور میں یہ خاص ملکہ تھا کہ وہ ہر کس و ناکس سے اپنے کاموں میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تعاون حاصل کر لیتے تھے۔ ۱۹۴۴ء کی شاندار "کل ہند اردو کانگریس" میں انھوں نے حیدرآباد کے نامور جاگیرداروں، نوابوں اور اہم عہدیداروں کا تعاون جس خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ حاصل کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ ڈاکٹر زور کے بڑے مداح تھے۔ ان کی مدد سے بشیر باغ پیلس میں بیرون ریاست کے معزز مہمانوں کے قیام کا انتظام کروایا جو کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ وہ قصر تھا جسے حیدرآباد کی معزز شخصیتوں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ سر شیخ عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی، رشید احمد صدیقی اور عبدالحق کا قیام اسی مشہور پیلس میں رہا۔ ڈاکٹر زور کے شاگردوں کا

ایک گروہ کانگرس کے کاروبار کے لیے وقف ہوچکا تھا اس زمانے میں حیدرآباد میں پٹرول کی راشننگ تھی اور اس کی فراہمی جوے شیر لانے سے کم نہ تھی لیکن ڈاکٹر زور جب کسی کام کا مصمم ارادہ کرلیتے تو اسے بہر قیمت عملی جامہ پہناتے اور مشکلات اور حالات سے پست ہمت ار رکبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے۔ نامساعد حالات سے دل برداشتہ ہونا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ مخالفین کی ڈاکٹر زور نے کبھی پرواہ نہیں کی، خود بے نکان کام کرتے اور اپنے معاونین کو ہمت دلاتے اور ان سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لینے کا گر خوب جانتے تھے وہ سختیوں سے گھبرانے والے انسان نہیں تھے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نامساعد حالات کے چیلنج کو قبول کرکے وہ ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور کی زندگی میں ایک عجب طرح کی دوزنگی نظر آتی ہے۔ جوانی میں وہ ایک کہنہ سال اور تجربہ کار دانشور کی طرح کام کرتے رہے اور بڑھاپے میں جوانوں کے سے جوش وخروش، ولولے سرگرمی اور کارگزاری کا مظاہرہ کیا۔ وہ دن رات دماغی کام میں مصروف رہتے لیکن جسمانی ورزش اور محنت ومشقت کا نہ تو موقع ملتا تھا اور نہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی باغبانی سے شوق کرلیا کرتے تھے یا تھوڑی سی چہل قدمی کرلیتے۔ صبح وشام کا وقت عام طور پر لوگ تفریح کے لیے مختص کردیتے ہیں لیکن ڈاکٹر زور ان اوقات میں بھی علمی وادبی کاموں میں مصروف رہتے۔ پروفیسر عبدالمجید لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زور میں ایسی قوت محرکہ تھی کہ وہ برسوں کا کام ہفتوں میں کرتے تھے۔

ڈاکٹر زور کی زود نویسی جہاں ان کے قلم سے متعدد بیش بہا تصانیف کو منصۂ شہود پر لائی وہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ ہر تصنیف کے لیے تھوڑا سا وقت اور نکال سکتے تو ان کتابوں کی ادبی قدر وقیمت میں اور اضافہ ہوتا۔ ڈاکٹر زور کی بعض تصانیف پر سخت تنقیدیں بھی کی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عدیم الفرصتی اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی خواہش کے سبب ڈاکٹر زور وسعت

اور گہرائی دونوں کو بیک وقت برقرار نہ رکھ سکے تھے۔ ڈاکٹر زور کے بارے میں احتشام حسین رقمطراز ہیں:۔

"ڈاکٹر زور کام جلد کرتے تھے زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے وہ ضروری اجزا کو یکجا کردینے کو اہمیت دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کتابوں کا مواد فراہم کرتے جاتے اور اسی طرح کئی کتابیں ایک ہی ساتھ ترتیب پا جاتی تھیں ..... اسی طرح ان کے تفصیلی کاموں میں تیز رفتاری آجاتی تھی اگرچہ معیار کو نقصان پہنچ جاتا تھا۔"

ڈاکٹر زور ایک وسیع القلب انسان تھے دوست دشمن سب سے خوش دلی اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے اور اپنے مخالفین سے بھی دل میں بغض وعناد نہیں رکھتے تھے۔ جب ڈاکٹر زور دارالعلوم کالج کے پرنسپل بن کر آئے تو انھوں نے سب سے پہلے باقی صاحب سے مصافحہ کیا اور کہا "آج ہماری دوستی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے" لوگوں نے خیال کیا کہ باقی صاحب چونکہ اسٹاف میں سب سے سینیر تھے اس لیے غالباً ڈاکٹر زور نے ایسا کیا ہوگا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ باقی صاحب کے دل میں ڈاکٹر زور کی طرف سے کچھ رنجش تھی اس لیے انھوں نے مصافحہ کرکے دلوں کی کدورت مٹانے کی کوشش کی تھی۔

محمود حسین جو چادر گھاٹ کالج میں ڈاکٹر زور کے رفیق کار تھے ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک چپراسی کی شکایتیں ڈاکٹر زور کو مسلسل وصول ہو رہی تھیں اور وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں غفلت برت رہا تھا۔ انھوں نے بلا کر سمجھایا۔ جب وہ اس پر بھی باز نہ آیا تو ڈاکٹر زور نے اُسے بری طرح ڈانٹ دیا جس پر چپراسی بہت افسردہ ہوگیا اور ڈاکٹر زور سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ چپراسی کے اس طرز عمل سے انھیں بہت تکلیف ہوئی ایک دن اس کو اپنے پاس بلوایا اور پیٹھ تھپتھپا کے کہنے لگے میری جگہ

کوئی اور ہوتا تو کچھ نہیں تو تمہیں جرمانہ ہی کر دیتا۔ میری باتوں کا بُرا نہ ماننا تمھارے بھلے کے لیے تمھیں سرزنش کی تھی ڈاکٹر زور کے زمانۂ پرنسپلی میں پھر کبھی اس چپراسی کی شکایت وصول نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر زور عفو و درگذر کا مجسمہ تھے جو لوگ ان سے بدسلوکی کرتے یا انھیں رنج پہنچانے کی کوشش کرتے یا ان کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوتے ڈاکٹر زور کا سلوک ان سے بڑا دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا۔ ڈاکٹر زور بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کی خطا کو درگذر کر دیتے اس سے ان کی اعلیٰ ظرفی کا اظہار ہوتا ہے۔ محمود حسین لکھتے ہیں کہ چادر گھاٹ کالج میں ایک کلرک نے ناراض ہو کر یونیورسٹی کو ڈاکٹر زور کی شکایت لکھ بھیجی تھی انھیں اس کا علم ہوا تو ان کے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس کے جواب میں انھوں نے اپنی کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کلرک کے استقلال کی پرزور سفارش جامعہ کو روانہ کر دی۔

۱۹۵۰ء میں دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج کا انضمام عمل میں آیا نیچے چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل کا اجلاس مقرر ہوا اور ڈاکٹر زور نے اوپر کی منزل میں اپنے لیے ایک علٰحدہ کمرہ منتخب کر لیا۔ ایک ہی کالج میں دو پرنسپل تھے یعنی ایک نیام میں دو تلواریں۔ دوسرے پرنسپل صاحب اساتذہ کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ ہر کاغذ پر میرے دستخط ہونے چاہئیں لیکن ڈاکٹر زور اس کے برخلاف اساتذہ سے یہی کہا کرتے تھے کہ "بھئی پرنسپل کوئی ہو آپ کو ملازمت کرنی ہے انھیں کیوں ناراض کرتے ہو" اس طرح کی دوعملی کے ماحول میں کوئی اور شخص ہوتا تو شاید اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا لیکن ڈاکٹر زور نے دوسرے پرنسپل سے کبھی کوئی تلخی پیدا نہیں ہونے دی۔ آئیلو چپراسی اچھا کام کرتا تھا اس کی فرض شناسی اور سلیقے کے پیش نظر ڈاکٹر زور اپنا ہر کام اس سے لیتے اس پر بعض لوگ طنزاً آئیلو کو وائس پرنسپل کہنے لگے تھے ڈاکٹر زور اس کا بُرا نہیں مانتے تھے۔ ایک مرتبہ

ان کے سامنے کسی نے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا "میں تو ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا لیکن ایسا نہ ہو کہ اساتذہ میں سے کسی کو جو اس پوسٹ کا خواہشمند ہو، یہ بات گراں گذرے۔"

دفتر کے ایک کلرک اکثر اوقات کار میں اپنی سیٹ پر نظر نہیں آتے تھے جب ان سے باز پرس کی جاتی تو کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتے تھے۔ باتونی آدمی تھے اور درباری گفتگو کے فن سے خوب واقف تھے۔ ڈاکٹر زور کے پاس شکایت آئی تو انھوں نے بلا کر تنبیہ کی تو کلرک نے عذر لنگ پیش کیا۔ اس کی لچھے دار گفتگو سن کر ڈاکٹر زور ہنسنے لگے اور کہا "مرزا صاحب آپ کو تو واجد علی شاہ کے دربار میں ہونا چاہیے تھا۔ ارباب قضا و قدر کی بھول سے آپ چادر گھاٹ کالج کے اہلکار بن گئے۔"

۱۹۶۰ء میں جب ڈاکٹر زور وظیفے پر علیحدہ ہوئے تو ان کا وداعی جلسہ مقرر ہوا اور ان تمام اساتذہ کو مدعو کیا گیا جو مختلف کالجوں میں ڈاکٹر زور کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ پرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا اور جلسے میں لوگ کثیر تعداد میں جمع تھے۔ ہر مقرر اپنی تقریر میں اظہار افسوس کرتا۔ ان کے عزیز شاگرد خواجہ حمید الدین شاہد پاکستان سے شرکت کے لیے بطور خاص حیدرآباد آئے تھے جب تقریر شروع کی تو رونے لگے، سب افسردہ تھے لیکن ڈاکٹر زور وہ واحد شخص تھے جن کے چہرے سے بشاشت ٹپک رہی تھی۔ نامزد پرنسپل باقر فریدی کو اصرار کر کے اپنی کرسی پر بٹھایا اور مسکرا کے اُن سے گفتگو بھی کرنے لگے۔ یہ معمولی ظرف اور حوصلے کی بات نہیں۔ ڈاکٹر زور کی زندہ دلی نے انھیں ہمیشہ شگفتہ رکھا اور سخت شکن حالات میں بھی وہ مسکراتے ہوئے نظر آئے داغ نے اپنے بارے میں کہا تھا ؎

شگفتہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار بن کے رہے ہم جس انجمن میں رہے

یہی بات ڈاکٹر زور پر صادق آتی ہے۔ وہ ایک رجائیت پسند انسان تھے۔ مایوسی قنوطیت اور بے بسی سے وہ ہمیشہ ناآشنا رہے۔ جہاں بانو نقوی لکھتی ہیں "ان کے نام میں زندگی اور تخلص میں طاقت تھی اور وہ اس طاقت کے سہارے اردو کو بھی طاقتور بنانا چاہتے تھے۔ اس کو زندہ رکھنے پر تلے ہوئے تھے کام کرتے، کام کراتے، کام سے جی چرانے والوں کو ڈانٹ بھی دیتے ہیں، خفا بھی ہوتے ہیں۔ طنز بھی کرتے ہیں"۔ ڈاکٹر زور کے طرز تکلم کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ جن احباب، شاگردوں اور نیازمندوں سے ان کی خاص راہ و رسم ہوتی وہ ان سے اتنی ہی زیادہ بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے اپنے خلوص کے اظہار کا ان کے یہاں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جس شخص پر ان کی شفقت ہوتی وہ اس شخص کی غلطی یا کبھی کبھی اپنی کسی غلط فہمی پر اس کی اچھی طرح تبنیہ کرتے اور اگر وہ شخص ان کی باتوں کا برا مان لیتا تو انھیں اس سے دکھ ہوتا کہ ان کے خلوص کی قدر نہیں کی گئی اور ان کی شفقت کے جذبے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ یہ خلوص اور نوازش کا پہلو ان کی گفتگو اور حرکات و سکنات میں ہر وقت نمایاں رہتا۔

علمی اور ادبی معاملات میں ڈاکٹر زور کے خیالات اپنے بعض احباب کے تصورات سے ہم آہنگ نہیں تھے اور تصورات کے اس اختلاف نے ذرا گہرا رنگ بھی اختیار کر لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر زور جب ان حضرات کا ذکر کرتے تو ان کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو جاتا اور ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہو کر نجی زندگی کے حوالوں کا بھی احاطہ کر لیتا لیکن ڈاکٹر زور نے اپنے قلم یا عمل سے کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اور یہ بات ان کی عظمت کی شاہد ہے۔ انسان کی چھوٹی چھوٹی اور غیر مغفرت رساں کمزوریوں میں بشریت کی شان نظر آتی ہے۔ آدمی کی حقیقی عظمت اس میں نہیں کہ وہ اوتاروں کی صف میں کھڑا ہو، انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بشریت کے تقاضوں

کی تکمیل کرتے ہوئے بھی انسانیت کی سطح سے نیچے نہ آئے۔ اگر ڈاکٹر زور اپنے مخالفین سے جنگ کرتے رہتے تو ان کی صلاحیتیں رائیگاں ہو جاتیں انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور محبت و تسخیر قلوب سے کامیابی حاصل کی۔ یہ رویہ ان کی فراست و ذہانت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ڈاکٹر زور سے مل کر اکثر لوگ ان کی مخالفت بھول جاتے تھے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ "زور صاحب کے نام اور شخصیت میں ایک اساطیری کشش تھی"۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

ایوانِ اُردو ڈاکٹر زور کا ایک ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی اُردو سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور انھوں نے اس محبت کا حق ادا کر دیا۔ ایوان اُردو سنگ و خشت کی ایک خوبصورت عمارت ہی نہیں ڈاکٹر زور کے خوابوں کی تعبیر اور ان کی مشقتوں اور آرزوں کی صورت گری اور ان کا "شہر آرزو" تھا آج سے کچھ عرصہ قبل حیدر آباد میں اردو کتابوں کی اشاعت کرنے والا کوئی ایسا ناشر موجود نہیں تھا جو شعراء اور ادیبوں کی تصانیف شائع کر کے انھیں تھوڑا سا معاوضہ بھی دے سکتا۔ مطبع ابراہیمیہ اور مکتبۂ ابراہیمیہ میں اردو کتابوں کی اشاعت کا انتظام تھا اور کتابوں کی نکاسی کا انصرام بھی لیکن مصنفین کی حوصلہ افزائی کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہو سکا تھا ابتدا ہی سے ڈاکٹر زور اُردو کی ادبی شخصیتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے، تو انھوں نے حیدر آباد کے شعرا اور ادیبوں کے ادبی ذوق کو ابھارنے، انھیں ایک دوسرے سے قریب کرنے اور منظم انداز میں متحدہ طور پر اردو زبان کی خدمت کرنے کے مقصد کے تحت ایک علمی انجمن کی بنا ڈالی جس میں ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ ہر جلسے میں مختلف موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے، کلام سنایا جاتا اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ حیدر آباد کے خوش فکر نوجوانوں میں طاہر علی خاں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، میر ولی الدین،

سیادت علی خان، میر نواز جنگ، سید محمد اور عمر یافعی وغیرہ ان جلسوں میں شریک ہوتے، خود مضامین سناتے اور دوسروں کی نگارشات پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ بعض مخالفین نے سر اکبر حیدری کو یہ باور کرایا کہ یہ نوجوان اپنے جلسوں میں ادب کے نام پر سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور ریاست کے مفاد کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ سر اکبر حیدری نے اس انجمن میں شرکت کرنے والے نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور فرداً فرداً ہر ایک کو یہی سمجھایا کہ حکومت سے بغاوت کا نتیجہ تباہ کن ثابت ہوگا اور ساری ادب دوستی دھری رہ جائے گی۔ نوجوانوں نے لاکھ باور کروایا کہ یہ ادبی انجمن ہے اور سیاست سے اس کا کوئی واسطہ نہیں لیکن وہ اپنی معلومات کی صداقت منوانے پر مصر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حیدر آبادی نوجوان اس انجمن سے کنارہ کشی پر مجبور ہو گئے اور اس طرح اسے تحلیل کر دیا گیا لیکن اُردو کے ان پرستاروں نے ہمت نہیں ہاری اور ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر زور کی رہنمائی میں عبدالمجید صدیقی، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری کے تعاون سے ادارہ ادبیات اُردو کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور اس کے حسبِ ذیل مقاصد قرار پائے:

۱۔ اُردو زبان کے فروغ و اشاعت کے کام کو آگے بڑھانا
۲۔ اُردو شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا
۳۔ نوجوان شعراء اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنا اور تصنیف و تالیف کی سہولتیں بہم پہنچانا۔
۴۔ عوام کو اُردو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانا اور اس کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنا۔
۵۔ اردو زبان و ادب کو وسعت عطا کرنا اور اس کو مختلف علوم سے متعارف کروانا
۶۔ ملک کی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنے، قدیم آثار اور تاریخ و ادب کے شہ پاروں کی حفاظت کرنا۔

۷. ایک سہولت بخش کتب خانے کا قیام جس میں اُردو کتابوں کے مطالعے کا انتظام ہو اور خواتین کے ذوق کتب بینی کی تسکین ہو سکے ۔

ادارہ ادبیات اُردو کے قیام میں ڈاکٹر زور کو مخالفتوں اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ حیدر آباد کے ایک ادبی گروہ نے اسے انجمن ترقی اردو کا مدِ مقابل سمجھ لیا تھا اور اس کی ضرورت و اہمیت کے قائل نہیں تھے ۔ بہت سے حضرات میں اپنے طور پر کام کرنے کا بڑا سلیقہ موجود ہوتا ہے لیکن وہ دوسروں کے اشتراک سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ ڈاکٹر زور خود ان تھک کام کرتے تھے اور ان میں یہ خوبی اور صلاحیت موجود تھی کہ دوسروں کا بھرپور تعارف حاصل کر کے انھیں بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے کام پر لگا دیں چنانچہ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات کی بارہ شاخیں بنائیں اور اپنے ذمہ دار احباب کو جو اُردو کا کام پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ کرنا چاہتے تھے ، ان مختلف شاخوں کی دیکھ بھال کے کام پر مامور کیا اور ایک قلیل عرصے میں اُردو کے شیدائیوں کو کثیر تعداد میں اکٹھا کر لیا ۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے نشر و اشاعت کے کام پر خاص توجّہ کی تھی ۔ اشاعتی پروگرام کا آغاز میر حسن اور مخدوم کے ڈرامے "ہوش کے ناخن" سے ہوا جو ادارے کے نام کے ساتھ شائع ہوا تھا ۔ اس وقت یہ دونوں نوجوان اور ابھرتی ہوئی شخصیتیں تھیں ۔ ڈاکٹر زور کے مخالفین نے یہ محسوس کر لیا کہ ادارۂ ادبیات کا قیام خود غرضانہ بنیادوں پر عمل میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کے پیچھے اُردو کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے ۔ ادارے کے بانیوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تصانیف طبع نہیں کروائی تھیں بلکہ اپنے ہونہار شاگردوں کی حوصلہ افزائی کی تھی ۔ ڈاکٹر زور کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے نوجوان طبقے اور نئی نسل میں اپنی زبان کے لیے کام کرنے کی لگن پیدا کر دی اور انھیں احساسِ کمتری سے نجات دلائی ۔ ادارے کی ابتداء اس کے

بانیوں نے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ کی تھی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج یہی ادارہ ملک میں اُردو کا ایک قابلِ فخر ادارہ بن گیا ہے ۔ ڈاکٹر زور نے "ہوش کے ناخن" کے دیباچے میں صحیح لکھا تھا :

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں ۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے ادارہ ادبیات اُردو کو کام کی سہولت کی خاطر مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ قلیل عرصے میں ڈاکٹر زور اور اُردو کے دوسرے بہی خواہوں کی دلچسپی کی وجہ سے شعبوں نے اپنا مفوضہ کام باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دیا ۔ شعبۂ زبان سے اس وقت کے نامور اہلِ قلم وابستہ تھے ۔ قاضی عبد الغفار مدیر "کامریڈ" و "پیام" ڈاکٹر جعفر حسن ماہر عمرانیات ، سید محمد ، ڈاکٹر یوسف حسین عبد القادر سروری ، ضیاالدین انصاری ، ڈاکٹر راحت اللہ ، پنڈت ونشی دھر ودیالنکار اور خود ڈاکٹر زور شعبہ زبان کے لیے کام کر رہے تھے ۔ ان ادیبوں نے زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ۔ لفظوں کی تذکیر و تانیث ان کے مخصوص محل استعمال اور کہاوتوں اور پہیلیوں کو جمع کیا ۔ اس زمانے میں ریاست حیدر آباد کی سرکاری زبان اُردو تھی ۔ اس لئے دفاتر میں کاروبار کے لیے اسی کا چلن تھا ۔ ایسے الفاظ ، تراکیب اور اسی اصلاحات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا جو اس سلسلے میں استعمال کی جاتی تھیں اور ان پر ادارے کے پرچے "سب رس" میں اظہار خیال کیا جانے لگا ۔ "سب رس" ادارے کا ترجمان تھا اور جنوری ۱۹۳۸ء میں اس کا پہلا شمارہ طبع ہو کر منظر عام پر آیا تھا ۔ بچوں کے لیے "بچوں کا سب رس" اور "سب رس معلومات" شائع کیے تھے ۔ جو بعد میں بند کر دیے گئے اور "سب رس" ہی میں چند صفحات بچوں کے لیے مختص کر دیے گئے تھے ۔ رسالے کے اس حصّے میں محترمہ لطیف النساء بیگم ، بشیر النساء ، نعیم النساء اور دوسری خواتین کی نگارشات شائع ہو کر مقبول ہوئیں ۔ یہاں بطور خاص "من کی بتیا"

کی مصنفہ لطیف النساء بیگم کا نام قابلِ ذکر ہے جنھوں نے بچّوں کے لیے آسان زبان میں دلچسپ اور بصیرت افروز نظمیں شائع کیں۔

شعبۂ تنقید جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تنقید کو اردو داں طبقے میں مقبول بنانے اور مصنفین میں تنقیدی شعور پیدا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انگریزی ادب سے گہری واقفیت رکھنے والے اردو داں حضرات کو انگریزی تنقید کے اصولوں اور طریقہ عمل سے واقف کروائیں" سب رس" میں تنقیدی مضامین شائع کیے جاتے تھے اور تنقیدی ذوق کی آبیاری کے سامان فراہم کیے گئے تھے تصنیف و ترجمے کے شعبے کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ دوسری زبانوں میں (خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی) شائع ہونے والی اہم تخلیقات کو ترجمے کے ذریعے سے اُردو داں طبقے تک پہنچایا جائے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور ان کی نظر وسیع ہو سکے۔ اس شعبے کو پروفیسر عبدالمجید صدیقی، نواب علی یاور جنگ، منصب جنگ، نواب عنایت جنگ اور علی اصغر بلگرامی جیسی علم دوست اور معروف شخصیتوں کا تعاون حاصل تھا۔ اس شعبے کے قیام کا مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخ ہند میں چونکہ دکن کی تاریخ کو وہ مقام حاصل نہیں جس کی بجا طور پر وہ مستحق ہے، اس لیے تاریخ داں حضرات سے مختلف ایسی کتابیں لکھوائی جائیں جو دکن کی تاریخ و ثقافت کا احاطہ کر سکیں۔ اس شعبے نے بھی اپنی اچھی کارکردگی کا ثبوت دیا اور عبدالمجید صدیقی کی کتابیں "تاریخ گولکنڈہ" اور "مقدمہ تاریخ دکن" اور خود ڈاکٹر زور کی تصنیف "میر مومن" جیسی قابلِ قدر کتابیں منظرِ عام پر آسکیں۔ مبسوط تصانیف کے علاوہ تاریخی آثار اور اہم تاریخی شخصیتوں کے حالات بھی طبع ہوئے۔ تاریخی آثار کے تحفظ کے لیے اس شعبے نے حکومت سے بارہا نمایندگی کی اور کتبات کے چربے ادارے میں محفوظ کر دیے گئے اس طرح دکن کے تاریخی آثار کو امتدادِ زمانہ سے بچانے کی جدّوجہد میں اس شعبے نے نمایاں کارنامے انجام

دیے ہیں۔

ادارے کے ایک اور شعبے کا کام یہ تھا کہ وہ دکن کے شعراء اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کرے اس سلسلے میں شعراء کے دواوین کی اشاعت کے کام کی طرف توجہ کی گئی دکن کے شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی غرض سے تین جلدوں میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اور اس طرح انھیں دستبردِ زمانہ سے بچا لیا گیا۔ ڈاکٹر زور نے دکن میں شاعروں اور ادیبوں کی ایک ٹیم تیار کر دی۔ آج حیدرآباد میں مختلف اصنافِ ادب میں نام پیدا کرنے والے شعرا اور مصنفین کا وجود قدیم نسل کی حوصلہ افزائی کا رہینِ منّت ہے۔ شعراء کی ابدی خواب گاہوں کا پتہ چلایا گیا اور ان کے کتبے نصب کیے گئے اور مزاروں کی حفاظت کے خاطر خواہ انتظامات کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ ڈاکٹر زور چاہتے تھے کہ دکن کے تمام قدیم و جدید ادیبوں کی تخلیقات منظرِ عام پر آجائیں اور اس مقصد کی تکمیل کر کے انھوں نے تاریخ ادب اردو کی ترتیب و تدوین کرنے والوں کو اچھا مواد فراہم کر دیا ہے۔

شعبۂ سائنس کی اہمیت یہ تھی کہ اس نے سائنسی کتابوں کی اشاعت سے دلچسپی لی۔ اس وقت تک اردو میں طبعی علوم سے متعلق کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ شعبہ سائنس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ سائنسی علوم کی معلومات کو آسان اور عام فہم انداز میں عوام تک پہنچائے اور اردو ادب کو سائنسی معلومات سے مالا مال کر دے۔ اس شعبے کی جانب سے شائع شدہ کتابوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی اور انھیں بار بار طبع کرایا گیا۔

دکن کی مستورات پردہ نشین تھیں اور علمی معاملات میں مردوں کی برابری نہیں کر سکتی تھیں۔ شعبۂ خواتین نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں لکھنے پڑھنے کی ترغیب ہی نہیں دلائی بلکہ ان کی تصانیف کو شائع کر کے ان میں علمی ذوق اور عملی جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں "نذرِ دلی" کی اشاعت کا ذکر ضروری

ہے جس میں صرف خواتین ہی کے مضامین شامل ہیں ۔ شعبۂ خواتین کا سارا انتظام عورتوں کے ذمہ تھا ۔

طلبا کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادارۂ ادبیات اُردو نے ایک اور شعبے کے قیام پر زور دیا تھا تاکہ ابتدا ہی سے طلباء میں علم و ادب کی لگن پیدا کی جاسکے اور ان کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکے ۔

ادارۂ ادبیات اُردو میں نایاب کتابوں کے علاوہ نادر اشیاء، قدیم نقشہ جات ، ادیبوں کے خطوط، گرانمایہ مخطوطات اور قدیم فرامین و دستاویزات وغیرہ ارکان کی مساعی سے بہت جلد جمع ہونے لگے ۔ اب یہ کتب خانہ بذات خود ایک چھوٹا سا میوزیم بن گیا ہے ۔ ان ریسرچ اسکالروں کو جو دکنی ادب و ثقافت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اس ادارے سے علمی استفادہ کرنا ضروری ہے ۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے اپنے نوادرات قدیم ذخائر نایاب فرامین و قدیم نقشہ جات، تصاویر اور قدیم اسلحہ کی بدولت حیدرآباد کی ایک قومی یادگار کی حیثیت اختیار کرلی ہے ۔

تعلیم بالغان کے پیش نظر دیہات کے رہنے والوں کے لیے اُردو سیکھنے کی سہولتیں بھی اس ادارے نے فراہم کی ہیں ۔ ہر سال ادارے کی جانب سے اُردو عالم اور اُردو فاضل وغیرہ کے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں اور اضلاع آندھرا پردیش کے وہ سب افراد جو اُردو سیکھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں ان امتحانوں میں بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں ۔ اضلاع کے باہر ادارے کے انٹی مرکز قائم ہیں ۔

ڈاکٹر زور ایک جامع انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب کرنے کی اسکیم کو روبہ عمل لانا چاہتے تھے انھوں نے اہل علم کے تعاون سے اس کا آغاز کیا تھا ۔ الف ممدودہ کے چند صفحات کو بطور نمونہ شائع کرکے علم و ادب کے ماہرین سے اس کے بارے میں جب رائے طلب کی گئی تو انھوں نے کلمات تحسین سے اس کی پذیرائی کی جس سے کارکنوں کی ہمت افزائی

ہوئی لیکن بدقسمتی سے مالی دشواریوں کی وجہ سے انسائیکلوپیڈیا کا کام جاری نہ رہ سکا ۔ حکومت کی امداد کے بغیر صرف ارکان کے عطایات سے اس کام کی تکمیل ممکن نہ تھی اس لیے بادل ناخواستہ اس اسکیم کو ادھورا چھوڑنا پڑا

ڈاکٹر زور یہ چاہتے تھے کہ اُردو کے تمام بہی خواہوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے تبادلۂ خیال کے ذریعہ سے اُن مسائل کی یکسوئی کی کوشش کی جائے جو تمام اردو داں طبقے کو در پیش تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں ایک کل ہند اردو کانگرس منعقد کی تھی اور مختلف مکاتب خیال کے افراد کو ملک کے مختلف حصوں سے دعوت دے کر بلوایا تھا ۔ اردو کانگرس کے اجلاس تین دن تک ہوتے رہے اور ان میں کئی مسائل زیر بحث آئے مثلاً اُردو رسم الخط اور اُردو کتب کی اشاعت وغیرہ ۔ یہ شاندار کانگریس بہت کامیاب ثابت ہوئی اور حیدرآباد کے شعراء اور ادباء کو شمالی ہند کی سربرآوردہ ادبی شخصیتوں کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ۔ مدعوئین میں سر عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی اور رشید احمد صدیقی جیسی بلند قامت شخصیتیں شامل تھیں ۔ ان مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام ادارے کے ذمہ تھا اور بشیر باغ پیلس میں بھی مہمانوں کی رہائش کا اہتمام کیا گیا تھا اب یہ پیلس نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ نئی وضع کے خوبصورت مکانات نے لے لی ہے

بانیان ادارہ ادبیات اردو کے سامنے بہت سے مفید منصوبے تھے جن کو وہ آہستہ آہستہ عملی جامہ پہناتے جا رہے تھے لیکن ادارے کا مالی موقف مستحکم نہیں تھا ۔ ادارے کی نہ کوئی اپنی عمارت تھی نہ ماہانہ آمدنی کا کوئی وسیلہ ۔ اس کے دفتر کے لیے ڈاکٹر زور نے اپنے گھر کا ایک حصہ وقف کردیا تھا ۔ لیکن یہ جگہ ناکافی تھی اس لیے انھوں نے بنگلے سے متصل چند چھوٹے کمرے تعمیر کرواکر ادارے کے دفتر کو اس میں منتقل کردیا ۔ حکومت حیدرآباد کے بعض اعلیٰ عہدیدار ڈاکٹر زور کی دیانت داری اور اردو دوستی کے بڑے مدّاح تھے

ان میں غلام محمد بھی تھے جو اس زمانے میں صدر المہام فینانس کے ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ وہ ادارے کی گرانقدر خدمات کو جو اس نے حکومت پر مالی بار ڈالے بغیر انجام دی تھیں دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔ غلام محمد کی دلچسپی کی وجہ سے ادارے کے لیے حکومت کی جانب سے گرانٹ منظور ہوئی۔ بیگم زور نے اپنے کمپاؤنڈ میں ایک پلاٹ ادارے کے لیے بطور عطیہ عنایت کیا۔ ایک عرصہ دراز سے ادارے کے لیے علیحدہ بلڈنگ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور حکومت سے نمایندگی بھی کی جاچکی تھی جس پر حکومت نے یک مشت رقم دینے کی بجائے عمارت کے لیے سالانہ رقم منظور کردی تھی۔ قطعہ اراضی حاصل ہونے کے بعد حکومت سے یہ رقم حاصل کرلی گئی اور بہزاد دکھن فیاض الدین آرکیٹکٹ سے اس کا خوبصورت پلان تیار کروایا گیا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مغل، قطب شاہی اور دیگر طرز تعمیر کے امتزاج سے ایک دلکشین نقشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ نواب سالار جنگ، نظام شوگر فیکٹری سنگارینی کالریز اور ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کے عطیات اور حکومت کشمیر اور حکومت آندھرا پردیش کی اعانت سے ڈاکٹر زور کا یہ حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکا۔ آج ایوان اُردو کی نظر فریب عمارت پنجہ گٹہ روڈ پر ہر راہرو کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ اس کا افتتاح بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ ادارے کی عمارت کے لیے ۱۹۴۶ء میں حسن نظامی نے "ایوان اُردو" نام تجویز کیا تھا آصف جاہی دورِ حکومت میں ممالک محروسہ کے مختلف اضلاع جیسے ورنگل اور گلبرگہ وغیرہ میں "ایوان شاہی" ہوا کرتے تھے جن میں شاہی خاندان کے افراد یا پھر اہم عہدیدار قیام کرسکتے تھے یہ عوام کے لیے نہیں تھے۔ آج ان ایوانوں کا نقشہ بدل گیا ہے لیکن ایوانِ اُردو جس کی تعمیر میں ڈاکٹر زور جیسے سرفروش مجاہد اردو کا لہو صرف ہوا ہے آج بھی اپنی دلکشی اور وقار کے ساتھ موجود ہے اور اس طرح ڈاکٹر زور کی بے لوث خدمت گزاری اور اُردو سے ان کے والہانہ

عشق کی اس یادگار نے اپنے بانی کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ جب تک ادارۂ ادبیات اردو کی ایک کتاب اور ایوان اُردو کی ایک اینٹ بھی باقی رہے گی لوگوں کے دلوں سے ڈاکٹر زور کی یاد محو نہیں ہوسکے گی۔

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی ڈاکٹر زور کی مساعی کا رہینِ منت ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی پہلی کتاب راقمۃ الحروف کی تصنیف "ماسٹر رامچندر اور اُردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ" ہے، جو ۱۹۶۰ء میں ٹائپ میں شائع ہوئی۔ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۹۵۹ میں عمل میں آیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے طور پر یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد فلسفہ، ثقافت اور مختلف زبانوں میں تحقیق کے کام کی رفتار کو تیز کرنا اور نئے موضوعات پر ریسرچ اسکالروں سے تحقیقی کام کروانا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر گوپال ریڈی، ڈاکٹر تاراچند، شری کرشنا کرپلانی اور ڈاکٹر زور جیسی علم دوست شخصیتیں اس کی فاؤنڈر ممبر تھیں۔ ابتدا میں انسٹی ٹیوٹ ایوان اردو کی عمارت کے ایک حصے میں کام کرتا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں باغ عامہ کی بلڈنگ میں اس کا دفتر منتقل ہو گیا۔ ادارے اور ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کاروبار ڈاکٹر زور کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے سفر اور حضر میں ان کے خیال سے غافل ہونا ڈاکٹر زور کے لیے ناممکن تھا۔ ڈاکٹر زور کے بعض احباب ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک رات طوفانی بارش شروع ہوگئی اور ڈاکٹر زور چونک کر اٹھ بیٹھے۔ سب سے پہلے انہیں ادارۂ ادبیات اُردو کے دارالمطالعے کا خیال آیا (اس میں جالی لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہندو پاک کے معیاری رسالے مطالعے کے لیے رکھے جاتے ہیں) اگر ہوا تیز چلے یا بارش زیادہ ہو تو پانی اندر بھی آجاتا ہے۔ اس خیال سے ڈاکٹر زور بے چین ہوگئے کہ کہیں تمام رسالے بھیگ کر خراب نہ ہوجائیں۔ انھوں نے اپنے کمرے

کا سوئچ آن کیا لیکن روشنی ندارد۔ کرنٹ نہیں تھا۔ بہ دقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل اُٹھالائے اسے روشن کیا اور بھیگتے ہوئے ایوان اُردو پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا اور دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیے اور ڈاکٹر زور کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ اس مشقت میں رات کا کتنا حصہ گذر گیا۔

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر زور ایک ممتاز ماہر لسانیات، ایک اچھے نقاد اور افسانہ نویس ہی نہیں ایک بلند پایہ محقق بھی تھے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیقی کاوشیں ان کے رچے ہوئے تاریخی اور ادبی شعور کی ترجمان ہیں۔ سرزمین دکن سے ڈاکٹر زور کی والہانہ وابستگی نے انھیں اُردو کے اس قدیم اور اہم مرکز کے ادب پاروں کی بازیافت کی طرف متوجہ کیا جب ہم ڈاکٹر زور کی تحقیقی مساعی کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یوں تو بہمنی اور عادل شاہی دور کی ادبی شخصیتوں کو بھی گوشۂ گمنامی سے باہر نکالا اور نئی نسل سے ان کے فن کو متعارف کروایا ہے، لیکن ڈاکٹر زور کی بہترین تحقیقی صلاحیتیں ان کی ذہانت و بصیرت اور جگر کاوی و ریاضت کا بھرپور اظہار ان ادبی تحقیقات میں نظر آتا ہے جو قطب شاہی دور سے متعلق ہیں۔ اس کا ایک نفسیاتی اور تاریخی سبب بھی تھا جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اٹھارویں صدی کی پہلی دہائی میں مغلیہ سلطنت کی سالمیت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں جو معاشی اور اقتصادی اعتبار سے خود کفیل تھیں، آزاد سیاسی اکائیاں بن چکی تھیں۔ انھیں بعض مورخوں نے قومی مرکزیت کے تصور کے پیش نظر محض سیاسی معروضات سے بھی تعبیر کیا ہے

ہندوستان کے دوسرے تہذیبی مراکز کی طرح حیدرآباد میں بھی ثقافتی اور

معاشرتی روایات کا ایک تاریخی سلسلہ موجود تھا یہ تہذیبی وحدت ماضی میں ہی روایات کا تسلسل قطب شاہوں کے گولکنڈے میں تلاش کرتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے اس کی وجہ یہ تھی کہ تسخیر گولکنڈہ کے بعد دکن میں مغل اپنا تہذیبی اثر و رسوخ پیدا بھی نہ کر سکے تھے کہ شمال میں ان کی شہنشاہیت کا چراغ انقلاب زمانہ کی آندھیوں سے بجھنے لگا۔ مغلوں کے جانشین آصف جاہی حکمراں خود دکن میں مقبولیت حاصل کرنے قطب شاہی روایات کی پذیرائی کے قائل تھے۔ دکنیوں کو قطب شاہی تہذیب سے اس لیے موانست اور محبت و عقیدت تھی کہ یہ تہذیب ان کی سماجی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی اور اس کا نفسیاتی اور اخلاقی اثر سالہا سال سے یہاں برابر قائم تھا جس ثقافتی وحدت کو دکنی تہذیب کہا گیا ہے وہ در اصل مغل تہذیب سے دوری اور انحراف و تردید اور قطب شاہی تہذیب کی روایات کی پاسداری کے رجحانات کی ترجمانی تھی۔ ڈاکٹر زور کے ادبی شعور کی نشو و نما اسی دکنی تہذیب کے گہوارے میں ہوئی اس کا نفسیاتی اثر اس طرح بھی ظاہر ہوا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس تہذیب کو جو قطب شاہی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی اور جس کا ایک اہم عنصر دکنی زبان بھی تھی، اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ اردوے قدیم کی بازیافت کی۔ مہم میں ڈاکٹر زور تمام عمر بڑے خلوص، دردمندی اور لگن کے ساتھ مصروف رہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ شمال میں جس زبان کو "اک بات لچر سی" کہا گیا تھا وہ علم و ادب کے انمول خزانوں سے مالا مال تھی جس نے ایسے شاعر اور ادیب پیدا کیے تھے جن کی تخلیقات نے اردو ادب کو سربلند اور سرفراز کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کی تحقیقات نے اردو ادب کی تاریخ کو ایک صدی آگے بڑھا دیا۔ دکنی ادبیات کی بازآفرینی محض چند شعری مجموعوں یا نثری کارناموں کا احیا نہیں بلکہ ان کے ذریعے سے ایک پوری تہذیب کو زندگیٔ جدید اور ایک مکمل ثقافتی دور کو حیات نو عطا کی گئی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدرآباد میں علوم و فنون کا نشاۃ ثانیہ عمل میں آیا تھا۔ اس درسگاہ کے جن سپوتوں نے علم و ادب اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں زندۂ جاوید

کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان میں ڈاکٹر زور کا نام سرفہرست نظر آتا ہے انھوں نے اپنی ادبی خدمات کے ذریعے سے اہل دکن کی لسانی خود اعتمادی کو بحال کرنے کی کوشش کی اور ان میں یہ احساس بھی پیدا کیا کہ ان کی زبان کا سلسلہ ایک وقیع اور قابل فخر ادبی سرمائے اور لسانی سرچشمے سے جا ملتا ہے انھوں نے نہ صرف قطب شاہی عہد کی گنگا جمنی تہذیب اور اس سرزمین کی عظمت رفتہ کو بے نقاب کیا بلکہ یہاں کے عظیم شہ پاروں کو منظر عام پر لا کر دکنی زبان و ادب کی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ قائم کر دی۔ ڈاکٹر زور دکنی ادب کی بازیافت کو ایک تحریک اور ایک مہم نہ بنا لیتے تو ادب کے ان محسنوں کے درخشندہ کارنامے مرور زمانہ کے گرد و غبار میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاتے۔ ڈاکٹر زور کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس نے ان کے نام کو اردو زبان کی تاریخ میں لافانی بنا دیا ہے۔ انھوں نے نئی نسل میں اپنے تہذیبی اور ادبی کارناموں پر ناز کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور اسی جذبے سے سرشار ہو کر آج حیدرآباد میں نئی نسل کے محققین بھی دکنی ادب کے قدیم کارناموں سے دلچسپی لے رہے ہیں۔

ایک سچے محقق کی طرح ڈاکٹر زور تحقیق کے کسی گوشے کو ادھورا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے سختیاں جھیلیں اور راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اورنگ آباد، بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور حیدرآباد کے دوسرے مواضعات کا سفر کیا اور بہت سے ہیرے جو خس و خاشاک کے انبار میں دب گئے تھے، ڈھونڈ نکالے۔ شاعروں اور مصنفین کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کی کھوج کے علاوہ ان کی ابدی خوابگاہوں کو بھی ڈھونڈھ نکالا، روشنی کا انتظام کروایا، لوح مزار نصب کروائی اور ان کی تعمیر و نگہداشت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دکن کے ایک مشہور شاعر میر شمس الدین فیض کے مزار کے متعلق انھوں نے مجھے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد لال دروازے کے

اس گورستان کا پتہ چلایا جہاں فیض مدفون ہیں۔ یہاں ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا، قبریں ہر جگہ انتہائی شکستہ حالت میں تھیں اور ہر طرف مٹی کے ڈھیر اور کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یہاں دریافت کرنے پر مقامی لوگوں نے فیض کی قبر کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر زور کہتے تھے کہ "یہ قبر دوسری قبروں کے مقابلے میں بہت صاف اور گرد و غبار سے پاک تھی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں فیض کی قبر کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا! غرض میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایت کرنے کے بعد گھر واپس آگیا۔ مجھے بار بار یہی فکر ستاتی تھی۔ میں نے فیض کا دیوان اٹھالیا اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے دیوان کھولا۔ اب جو پہلے صفحے پر نظر کی تو یہ شعر لکھا ہوا دیکھا ؎

موجۂ بادِ بہارِ چمنستانِ بہشت
مشہدِ فیض پہ جاروب کشی کرتا ہے

اور اس شعر کو پڑھ کر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔" جن محققین نے قدیم ادب پر تحقیقی کام کیا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ قدیم دکنی مخطوطات کا پڑھنا جوئے شیر سے کم نہیں ہوتا۔ وہ محققین بھی جنھوں نے سالہا سال دکنی ادب پر کام کیا ہے ان قدیم مخطوطات کے مطالعے میں دقت محسوس کرتے ہیں کیونکہ کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت کے باعث جگہ جگہ "ناطقہ سر بگریباں" ہو جاتا ہے۔ بعض کاتبوں کو مرکزوں اور شوشوں سے بغض ہوتا ہے اور بعض کاتب کاغذ سے قلم اٹھانا جانتے ہی نہیں۔ بعض نسخوں میں حروف ایک دوسرے میں اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنا پیوست ہوتا ہے کہ ان کی قرأت مشکل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر زور میں مخطوطات پڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی۔ وہ انھیں اس روانی اور بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ پڑھ ڈالتے جیسے ہم اخبار یا کوئی رسالہ پڑھتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال سے انھیں دکنی مخطوطات پڑھنے کی مشق تھی۔ ڈاکٹر زور کہا کرتے تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں ان کا پروگرام یہ

ہوتا تھا کہ وہ اور سید محمد صاحب روزانہ شام میں حیدر آباد کے مختلف کتب خانوں میں بیٹھ کر مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

ایک دفعہ نواب عنایت جنگ بہادر نے ڈاکٹر زور کے پاس "من سمجھاون" کا ایک مخطوطہ بطور تحفہ ادارہ ادبیات اردو کے لیے روانہ کیا۔ اس مخطوطے کو آئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میں ڈاکٹر زور کے یہاں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا "ہمارے ادارے کے لیے آج ایک بڑا نایاب اور کارآمد نسخہ آیا ہے اگر آپ اسے ایڈٹ کر دیں تو ایک اچھا تحقیقی کام ہو جائے گا۔" اس کے بعد ڈاکٹر زور نے پہلے بند سے "من سمجھاون" سنانی شروع کی اور اس روانی سے دس پندرہ منٹ تک "من سمجھاون" سناتے رہے گویا وہ سلیس زبان میں خوش خط لکھی ہوئی کوئی جدید نظم پڑھ رہے ہوں۔ کمرے میں اس وقت جو حضرات بیٹھے ہوئے تھے وہ دنگ رہ گئے۔

ادبی تحقیق کے لیے ڈاکٹر زور نے جس میدان کا انتخاب کیا تھا وہ اس کے لیے ہر طرح موزوں تھے۔ گولکنڈے کی تہذیبی تاریخ کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ڈاکٹر زور کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی ادبی اور لسانی روایات کی منتشر تاریخ کو مربوط کر دیا۔ بکھری اور ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑ دیا جس سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے تسلسل کو سمجھنا آسان ہو گیا۔

"گولکنڈے کے ہیرے" اور "سیر گولکنڈہ" جیسی نیم تاریخی اور نیم افسانوی تصانیف پیش کر کے انھوں نے وہ مخصوص فضا تیار کر دی تھی جو دکنی تہذیب و ادب سے دلچسپی اور موانست پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کا مسلک وسعت تھا انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ دکنی شعرا اور ادیبوں کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں قدیم دکنی تخلیقات کو روشناس کروایا جائے اور دکنی ادب کی عظمت کا سکہ اردو دان طبقے کے دلوں پر

ٹھہادیں۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے بھی دکنی مخطوطات کی تدوین سے دلچسپی لی اور اس سلسلے میں کام بھی کیا تھا لیکن دکنیات سے انھیں وہ جذباتی وابستگی نہ تھی جو دکنی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر زور کو تھی۔ قطب شاہی دور وہ دور تھا جس میں ان کا تخیل سانس لیتا تھا۔ اس عہد پر تحقیقی کام کرنے کے لیے جس ہمدردانہ رویے کی ضرورت تھی وہ ڈاکٹر زور میں بدرجۂ اتم موجود تھا اور یہ کوئی غیر فطری بات بھی نہ تھی۔ ایک اور سہولت اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کو یہ میسر تھی کہ دکنی سمجھنا اور دکنی مخطوطات کی قرات ان کے لیے مشکل نہ تھی ان کے گھر کی زبان دکنی کا جدید روپ تھی۔ ڈاکٹر زور کا تعلق مشائخ خاندان سے تھا اور تصوف کی اصطلاحیں اور اس کے اسرار و رموز ان کے لیے نئے نہ تھے۔ اس خاندانی ذوق نے بھی دکن کے قدیم مخطوطات کی بازیافت و تفہیم میں ان کی اچھی رہبری کی۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں سے واقفیت نے بھی ان کی بہت سی مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے لسانیات کی یورپ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اس لیے الفاظ کی قدیم شکلوں، عہد بہ عہد تبدیلیوں اور لسانی تغیرات کو سمجھنا ان کے لیے دشوار نہ تھا۔ ڈاکٹر زور کے دل میں یہ جذبہ اور ولولہ بھی موجود تھا کہ دکنیوں کو جو اپنی روایتی انکساری کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں تھے، باہر نکالیں اور دنیا کو یہ دکھادیں کہ دکنیوں میں بھی اچھی علمی اور ادبی صلاحیتیں موجود ہیں وہ دوسروں سے پیچھے نہیں اور یہ کہ علم و ادب کے لازوال خزانے انھوں نے اپنے اسلاف سے ورثے میں پائے ہیں۔ یہ جذبہ دراصل اس مسابقت کی پیداوار تھا جو انھیں اپنی شناخت کے لیے اپنے بعض ہمعصروں سے کرنی پڑی تھی۔ دکنیات کا ذوق عام کرنے میں ڈاکٹر زور کا بڑا ہاتھ ہے۔ تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی قدآور شخصیت محقق کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے اور محقق گر کے اعتبار سے بھی۔

اپنے قیام یورپ سے قبل ڈاکٹر زور نے دکنیات کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔

انگلستان اور یورپ کے کتب خانوں میں انھیں بہت سے نادر دکنی مخطوطات دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں رسالہ "تجلی" میں ان کا مضمون "کتب خانہ جات شاہان اودھ" اور "دکھنیات" شائع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ایک اور مضمون "کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیات مشرق" بھی طبع ہوا جس میں انھوں نے بعض نایاب مخطوطات کی نشان دہی کی ہے۔

۱۹۳۵ء میں سٹی کالج میں "یوم ولی" منایا گیا اور اس کے سلسلے میں مخطوطات کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی تھی جس کے سرپرست نواب سالار جنگ بہادر تھے انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

> "اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہونا چاہیے بلکہ مناسب یہ ہے کہ دو صد سالہ جشن ولی کی یادگار میں کسی مستقل کام کا آغاز کیا جائے میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شاعروں اور صاحبان تصانیف کی اردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں، اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک جماعت منتخب کر لینی چاہیے۔ میں اس مبارک اور اہم کام میں اس جماعت کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوں"

اس تجویز پر عمل کیا گیا اور اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج کمیٹی کے صدر اور ڈاکٹر زور نائب صدر سید محمد اور میر سعادت علی رضوی شریک معتمد مقرر کیے گئے۔ قدیم دکنی ادب پاروں کی تدوین کے لیے یہ جماعت فال نیک ثابت ہوئی اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے افراد کا تعاون حاصل کر کے تحقیق و تدوین کا کام شروع کر دیا گیا۔ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کی ایڈیٹنگ کا کام ڈاکٹر زور کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور "سلسلہ یوسفیہ" کی دوسری تصانیف کی ترتیب و تدوین میں بھی محققین و مرتبین کی رہنمائی کرتے رہے۔ "سلسلۂ یوسفیہ" سے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کے علاوہ "کلیات سراج"

"قصہ بے نظیر" "پھول بن" "سیف الملوک و بدیع الجمال" "طوطی نامہ" "کلام الملوک" "کلیات عبداللہ قطب شاہ" "گلشن عشق" "مثنوی رضوان شاہ و روح افزا" "چندر بدن و مہیار" "تصویر جاناں" "پنچھی باچھا" اور "علی نامہ" جیسے قدیم دکنی شہ پارے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ ڈاکٹر زور نے ان سب کتابوں کی اشاعت سے خاص دلچسپی لی۔ اور اپنے مفید مشوروں سے مرتبین کو مستفید کیا۔

تحقیق ایک صبر آزما اور مشکل فن ہے اس میں جذبے کی لطافت و رنگینی اور تخیل کی حنا بندی یا طرزِ ادا کی پرکاری پر قناعت نہیں کی جا سکتی۔ یہ بڑی دیدہ ریزی، نظر گدازی اور ریاضت و مشقت کا کام ہے۔ اس کے آداب کو ملحوظ رکھنا اور اس سے عہدہ بر آ ہونا آسان کام نہیں۔ ڈاکٹر زور ایک ایسے کوہ کن تھے جنھوں نے تاریخ کی چٹانوں کا سینہ چاک کر کے جوئے شیر نکالی اور اردو کے چمن کی آبیاری کی۔

تحقیق اپنے موضوع کے ساتھ انصاف چاہتی ہے وہ مواد کو سلیقے سے اکٹھا کرنے اس کی صحیح جانچ پڑتال، اسناد کی صداقت کی چھان بین، تقابل، ردّ و قدح اور تنقیدی شعور کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر زور ایک مسلمہ محقق ہی نہیں ایک باذوق نقاد بھی تھے۔ اس لیے ان کی تحقیقی کاوشیں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ اور وقیع ہیں۔ انھوں نے تحقیق اور تدوین کے ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف مخطوطات کی تدوین کی تھی جو اس زمانے میں رائج و مقبول تھے۔ ایک محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر زور کا نام تاریخ ادب اردو کے صفحات سے محو نہیں ہو سکے گا۔ اردو شہ پارے "کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ" "تذکرہ مخطوطات" "گلزارِ ابراہیم" "سرگذشتِ حاتم"، اور "طالب و موہنی" تحقیق میں ڈاکٹر زور کی نکتہ رسی، رمز شناسی اور سلیقہ مندی کے شاہد ہیں۔

"اردو شہ پارے" ڈاکٹر زور کی پہلی تصنیف ہے "اردو شہ پارے" ڈاکٹر زور کی

ان تصانیف میں سے ہے جنھوں نے ان کے نام کو ادب کے نگار خانے کا ایک ناقابلِ فراموش نقش بنا دیا ہے۔ "اردو شہ پارے" خود ڈاکٹر زور کا شہ پارہ ہے۔ یہ تحقیقی موضوع پر لکھی ہوئی ان چند تصانیف میں سے ہے جنھوں نے محققین کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ قدیم ادب کے بارے میں ہماری معلومات محدود تھیں اور ہم اسلاف کے ان کارناموں سے ناواقف تھے جو دستبردِ زمانہ سے محو ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف ہندستان میں موجود قدیم مخطوطات کی مدد سے اس کتاب کا مواد اکٹھا کیا بلکہ یورپ اور لندن کے کتب خانوں میں ہماری زبان کے جو گوہرِ بے بہا بکھرے پڑے تھے انھیں بھی اس سلک گہر کی زینت بنا دیا ہے۔ ۱۰/ اپریل ۱۹۲۹ء کے ایک مکتوب میں ڈاکٹر زور نے سید رفیع الدین قادری کو تحریر کیا تھا: "میں چاہتا ہوں کہ قدیم مصنفوں کی جو قلمی کتابیں ہیں ان کے اچھے اچھے حصے منتخب کر کے چھپوا دوں۔ "دکنی شہ پارے" یا "اردو شہ پارے" کے نام سے جرمنی میں چھپوانے کا ارادہ ہے۔ (۱۵۰) پونڈ اخراجات ہوں گے۔ اس میں بعض شاعروں کی جو یہاں تصویریں دستیاب ہوئی ہیں انھیں بھی چھپوا دوں گا جرمنی کے ٹائپ میں اچھے کاغذ پر خوبصورت مجلد کتاب کے ایک ہزار نسخے چھپوانے کا ارادہ ہے" دکنی ادب کی تاریخ کا مطالعہ "اردو شہ پارے" کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ جدید محققین نے ڈاکٹر زور کی بعض معلومات کو غلط بھی ثابت کر دیا ہے کیونکہ گذشتہ چند سال میں نئے تحقیقی مواد نے نئے ادبی انکشافات کیے ہیں۔ "دکنی ادب کی تاریخ" میں ڈاکٹر زور "اردو شہ پارے" کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"اردو شہ پارے نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اپنے موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی اور بعض بیانات ظن اور قیاس پر مبنی تھے۔"

اس وقت جن وسائل سے کام لیا جاسکتا تھا ان کی مدد سے ڈاکٹر زورؔ نے اسے ترتیب دیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی ڈاکٹر زور کو لندن اور پیرس میں اُردو کے لسانی اور صوتی پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا تھا اور جس زمانے میں وہ یہاں زیر تعلیم تھے آکسفورڈ، کیمبرج اور اس کے علاوہ پیرس اور ایڈنبرا کی بہت سی نایاب قلمی کتابیں ان کی نظر سے گذری تھیں۔ ان میں سے بعض اتنی نادر تھیں کہ خود ہندوستان میں ان کے نسخے موجود نہیں تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر زورؔ نے اُردو داں طبقے کو ان نادر مخطوطات سے واقف کروانے کا منصوبہ بنالیا تھا چنانچہ واپسی پر انھوں نے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جو "اُردو شہ پارے" جیسی تصنیف کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ وؔلی کے بعد کی ادبی تاریخ پر روشنی ڈالنے والی کتابیں تو دستیاب ہوجاتی تھیں اس کے قبل کے دَور پر تاریکی کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر زورؔ نے اسی عہد کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔

باب اول میں اُردو ادب کے ان ابتدائی نمونوں پر تبصرہ کیا گیا ہے جو شمالی ہند گجرات اور دکن کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو ادب کے آغاز و ارتقاء میں مسعود سلمان، امیر خسرو، بہاء الدین شاہ علی جیو گام دھنی، شیخ خوب محمد اور خواجہ بندہ نواز وغیرہ کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے اور نمونہ کلام کو بھی کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ امیر خسرو اور خواجہ بندہ نواز کے بارے میں اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نہ امیر خسروؔ اُردو کے پہلے شاعر تھے اور نہ خواجہ بندہ نواز اُردو کے پہلے مصنف ڈاکٹر زورؔ نے مسعود کا زمانہ پانچویں صدی بتایا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ شاہ ارسلان بن مسعود حاکم لاہور اور سلطان ابراہیم کے زمانے کا شاعر تھا اور محمد عوفی کے "تذکرہ لباب الالباب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے تین دیوان مرتب کیے تھے جن میں سے ایک ہندی میں بھی تھا۔ وہ اس کے بارے میں رائے ظاہر کردیتے ہیں کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا وہ یقیناً اس زبان میں تھا جو پنجاب میں بولی جاتی تھی اور وہ زبان بہت ممکن

ہے کہ اردو کی بالکل ابتدائی صورت رہی ہو لیکن ڈاکٹر زورؔ نے اس سلسلے میں اپنا جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ یہ ہے:

"مسعود کی طرح خسروؔ کی زبان بھی مشتبہ ہے اس کے بعض شعر اس وقت موجود ہیں مگر یہ کچھ زیادہ معتبر نہیں معلوم ہوتے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر زورؔ نے لکھا ہے کہ امیر خسروؔ کو "خالق باری" کا مصنّف سمجھا جاتا تھا۔ لیکن محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ بہت بعد کے زمانے کی کتاب ہے اور زمانۂ حال کے مصنفین نے اس کو خسروؔ سے منسوب کردیا ہے۔ ایک علیحدہ عنوان "گجرات میں" قائم کرکے بہاء الدین باجن علی جیو گام دھنی اور شیخ خوب محمد چشتی جیسے قدیم گجراتی شعراء کے حالات جو دستیاب ہوسکے تھے، قلم بند کیے ہیں اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ "دکن میں" ایک علیحدہ باب کی سرخی ہے جس میں بہمنی سلطنت کے قیام اور دکن میں اُردو کی نشو و نما پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ علین الدین گنج العلم (۷۰۲ھ - ۷۹۵ھ) خواجہ بندہ نواز اور عبداللہ حسینی کا ذکر کیا ہے۔ وہ معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز کی کاوش بتاتے ہیں اب ثابت ہوچکا ہے کہ یہ کتاب مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔

باب دوم "اردو ادب بیجاپور میں" (۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء - ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء) ہے۔ یوسف عادل شاہ کے عہد کی ادبی شخصیت شاہ میران جی (۹۰۲ھ) تھے۔ اسماعیل عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ اول اور علی عادل شاہ اول (۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء - ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء) کے دَور میں برہان الدین جانمؔ، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں آتشی، مقیمی، امینؔ، اور نوریؔ کا ذکر کیا ہے۔ محمد عادل شاہ اور خدیجہ سلطان کے عہد میں صنعتیؔ، کمالؔ خان رستمیؔ، ملک خوشنود اور دولت جیسے شاعر موجود تھے، نصرتیؔ امین الدین اعلیٰؔ، ہاشمیؔ، مرزا اور ایاغیؔ کے حالات اور کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ - ۱۰۹۷ھ) کے دور میں سیّوا، اور موؔمن کے نام گنائے ہیں اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا ہے۔

باب سوم " اردو ادب گولکنڈہ میں" (۱۵۰۸ء/۹۱۴ھ تا ۱۶۸۷ء/۱۰۹۸ھ) ہے ابراہیم قطب شاہ کے دور کے شاعروں میں فیروز اور محمود کی نشان دہی کی ہے اور آخری چار تاجداروں کے عہد میں" ایک علٰحدہ سرخی قائم کر کے محمد قلی قطب شاہ، وجہی، احمد، خدا نما، محمد قطب شاہ، شوقی، خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، مقیمی، سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میران یعقوب، طبعی اور امین کے حالات اور ادبی کارناموں کو متعارف کروایا ہے۔ گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے دور کے شعراء میں ڈاکٹر زور نے فائز، لطیف، نوری شاہی، میرزا اور غلام علی کو جگہ دی ہے۔

باب چہارم " اردو ادب مغلوں کے دور میں" ہے۔ اس باب میں افضل، شیخ جیون، اور میر جعفر علی کا ذکر کیا ہے۔ دکن اور گجرات میں اس وقت جو شعراء موجود تھے ان میں "ملک الشعراء" کے شاعر عاجز، ضعیفی، امین، ذوقی، بحری، عشرتی، محرومی، احمد، ولی ویلوری، اشرف اور ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یورپ اور انگلستان کے مختلف کتب خانوں میں ان کی جو یادگاریں محفوظ ہیں ان کے حوالے دیے گئے ہیں۔

"دکنی مرثیے اڈنبرا میں" ایک مستقل سرخی قائم کی ہے اور اس کے تحت ہاشم علی، امامی رضا، غلامی، قادر اور نثر نگاروں میں شاہ محمد قادری اور رشید شاہ میر کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد "اردو شہ پارے" کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں پہلے شاعری اور اس کے بعد نثر کے انتخابات پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کے آخر میں آٹھ ضمیمے بھی ہیں جن کا مختلف ابواب سے تعلق ہے۔ سب کے آخر میں سنین کے زیر عنوان ۱۱۹۳ء یعنی محمد غوری کی فتح دہلی سے لے کر (۱۷۰۷ء) ولی اورنگ آبادی کی وفات تک سلسلہ وار سنین درج کیے گئے ہیں۔ اور ہر سن میں پیش آنے والے تاریخی واقعات یا ادبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں فرہنگ کے ذریعے سے اردو

شہ پاروں کے جو نمونے دیے گئے ہیں ان کے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ کتاب تین سو چھپن (۳۵۶) صفحات پر مشتمل ہے۔

"حب ترنگ" بحری کی مثنوی ہے جسے ڈاکٹر زور نے فرانسیسی زبان میں ایڈٹ کیا ہے۔ یہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں پیرس سے چھپی ہے جس کا فرانسیسی نام Les Contes du Hub Tarang ہے۔ ابتدا میں فرانسیسی زبان میں تمہید لکھی گئی ہے جس میں شاعر اور مثنوی کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ "حب ترنگ" کی ادبی قدر و قیمت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں دس مختلف حکایتیں بیان کی گئی ہیں اور آخری حکایت "غفلت از خود" ہے جس کے تین شعر یہ ہیں۔

شیخ چلی کے تھے گھر چار　　چڑھے بھرانے ایکس بار
اونچے چڑھ کر لیکھیا گیں　　گنتیں چھپرے ہوئے سو تین
جس پر بیٹھے آپ بھرائیں　　کس کوں گنتی ماں نہ لیائیں

"تذکرہ گلزار ابراہیم" "تذکرہ گلشن ہند" ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۴ء/۱۳۵۲ھ میں مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کروایا تھا۔ مقدمے میں ڈاکٹر زور نے اس تذکرے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "گلزار ابراہیم" معلومات کی وسعت اور صحت دونوں کے لحاظ سے ایک اہم تذکرہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اردو شعراء سے متعلق تذکروں کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں (۱) وہ تذکرے جن کے مصنف نامور شاعر تھے۔ (۲) کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگردوں کے لکھے ہوئے تذکرے (۳) سخن فہموں کے قلمبند کیے ہوئے تذکرے۔

پہلی قسم کے تذکروں کے مصنف چونکہ بلند پایہ شاعر تھے اس لیے انھوں نے صرف مسلم الثبوت شاعروں ہی کو درخور اعتناء سمجھا ہے اور درجہ دوم کے شاعروں کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا گیا ہے اگر کسی غیر معروف شاعر کا ذکر کیا بھی ہے تو اس بے اعتنائی کے ساتھ

کہ اس کے حالات زندگی اور کلام کے تعلق سے مختصر بیانات پر اکتفا کی گئی ہے اور ان شعرا کے کلام پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ دوسری قسم کے تذکروں میں چھوٹے بڑے سب ہی شاعر شامل کر لیے گئے ہیں لیکن بقول ڈاکٹر زور "وہ نہایت گمراہ کن" ہوتے ہیں اور ان کا مقصد اپنے استاد اور اس کے شاگردوں اور ایک مخصوص حلقہ سے تعلق رکھنے والے شعرا کو متعارف کروانا ہوتا ہے اور چونکہ اس میں جانب داری کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس لیے ان تذکروں میں شعراء کے کلام پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اس پر عصبیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان تذکروں میں شعراء اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر نہیں آتے ان کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ تیسری قسم کے تذکرے بہت کم لکھے گئے ہیں لیکن یہی تذکرے دراصل شاعروں کی صحیح قدر و قیمت اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین میں جانبداری اور گروہ بندی سے آزاد نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بالعموم تذکرہ نویس کلام کے نمونوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور شاعر کے حالات زندگی کی تحقیق پر کم توجہ کرتے ہیں۔ لیکن علی ابراہیم کا تذکرہ ان معدودے چند تذکروں میں سے ہے جن میں شعراء کے واقعات حیات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور اس تذکرے کو اردو کا بہترین تذکرہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ واقعی اردو شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورخ بن کر ان کے حالات کو قلم بند نہیں کیا۔ لیکن اگر اس طرح کی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا زیر بحث تذکرہ ہے جو اگرچہ ٹھیٹ تاریخی نقطہ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے تاہم اس لحاظ سے اردو کے سب تذکروں سے بہتر ہے"

اس تذکرے کی خوبیوں کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اس میں نہ تو کسی مخصوص دبستان کی وکالت کی گئی ہے اور نہ غیر ضروری طور پر کسی کی مخالفت کی گئی

ہے۔ تذکرہ نگار ابراہیم طبعاً منصف مزاج تھے۔ شاعری کا صحیح ذوق رکھتے تھے اور ان میں تحقیقی صلاحیتیں بھی موجود تھیں اس لیے اس تذکرے میں ان کے ان جوہروں کا عکس موجود ہے۔ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں:

"علی ابراہیم وہ واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے شاعر کے حالات اور ان کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوشش کیں اس سے قبل کے تذکروں میں نہ تو شعرا کی تاریخ ولادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ سن وفات"۔

علی ابراہیم برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ مغربی ادبیات کا ذوق رکھتے تھے اس لیے مغربی تصانیف میں جو بیانات اور سنین کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے وہ اس سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ذی اقتدار حاکم ہونے کی وجہ سے شعرا کے حالات جمع کرنے میں انھیں مدد ملی ہے۔ انھیں اپنے ان باذوق ملازمین سے بھی مدد ملی جو اپنے آقا کو خوش کرنے ان کی تصانیف کا زیادہ سے زیادہ مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ابراہیم نے شاعروں سے مختلف وسائل کے ذریعے سے ربط پیدا کیا ہے۔ جیسے اپنے ملازمین کی اعانت یا خط و کتابت کے وسیلے سے اپنے تذکرے کے لیے ممکنہ حد تک مستند مواد جمع کیا ہے اس تذکرے میں بھی شعراء کا حال حروف تہجی کی ترتیب میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا تو شعراء کے زمانے اور ماحول کو سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی۔ اس ترتیب کی خرابی یہ ہے کہ ایک حرف تہجی کے مختلف زبانوں کے شاعر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس تذکرے پر ایک اور اعتراض یہ کیا ہے کہ اس میں تاریخ تصنیف کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے اور بیشتر تذکرہ نویسوں یا تذکروں کا کوئی ذکر نہیں۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ علی ابراہیم نے سنی سنائی باتوں یا افواہوں پر تکیہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنے تذکرے کے لیے معتبر ماخذوں سے مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے

شعراء کی سیرت اور نجی واقعات پر بھی توجہ کی ہے اس اعتبار سے "گلزار ابراہیم" دوسرے تذکروں سے ممتاز نظر آتا ہے اس تذکرے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اُردو ادب کے ارتقاء اور اس کے تشکیلی مناظر کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شمالی ہند میں ۱۲۰۰ھ سے قبل اُردو نے کس حد تک ترقی کی تھی اور کن کن اصناف سخن میں شعراء طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ "گلزار ابراہیم" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں مرثیہ گوئی نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ یہ معلومات ہمعصر تذکروں میں موجود نہیں ہیں۔ ابراہیم نے خواجہ برہان الدین دہلوی اسد یار خان، شاہ قلی خان شاہی، خلیق دہلوی اور سکندر وغیرہ مرثیہ نگاروں کا ان کے نمونہ کلام کے ساتھ ذکر کیا ہے اسی طرح مثنوی نگاروں اور دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کا حال بھی درج کیا گیا ہے۔ سعادت امروہوی، کمترین دہلوی، فدوی لاہوری اور گدا علی بیگ بسمل کے شعری کمالات کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جائزہ لیا ہے ــــ "گلزار ابراہیم" عظیم آباد اور مرشد آباد کے علم و فضل اور شعر و سخن سے متعلق معلومات کا مفید مآخذ ہے۔ مرزا علی لطف نے اس پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے دو مختلف عنوانات کے تحت "سلاطین نامدار" کے وزرائے والا تبار" "امراء عالی مقدار" اور "شعرائے صاحب وقار" کے حالات جمع کیے ہیں۔

دوسرا حصہ نومشق اور کم معروف شاعروں کے حالات پر مشتمل تھا۔ لیکن ہم اس دوسرے حصے کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرتب بھی ہوا تھا یا نہیں؟ "گلزار ابراہیم" میں تین سو بیس شاعروں کا ذکر ہے جس میں صرف اڑسٹھ شاعروں کو علی لطف نے پہلے حصے کے لیے منتخب کیا ہے "گلشن ہند" کی اہمیت اس کے اضافوں سے ہے لطف نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ اضافے کیے ہیں لیکن وہ صرف تیس یا بتیس شاعروں کے

حالات اور ذکر ہی میں اضافے کر سکے ہیں۔ اگر لطف چاہتے تو آبرو، اثر، بیدار، حاتم سوز ضیا اور فغان کے حالات زندگی میں نئی معلومات کا اضافہ کر سکتے تھے۔ لطف نے شاہ عالم آفتاب، ابوالحسن تاناشاہ، آصف الدولہ آصف، انجام، قزلباش خان امید اور خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی نئی اور مفید تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں مرزا علی لطف نے کہیں کہیں علی ابراہیم سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان تمام امور کی نشان دہی کی ہے اور بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ اُردو کا یہ اہم تذکرہ مرتب کیا ہے۔

عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی:۔ اس کتاب میں آصف سابع میر عثمان علی خان کے عہد میں اُردو ادب کی نشو و نما اور سلطان وقت کی ادب نوازی و سرپرستی کا مفصل طور پر ذکر کیا گیا ہے اس کی اشاعت ۱۹۳۴ء میں عمل میں آئی یہ تصنیف حیدر آباد دکن میں اُردو زبان و ادب کی ترقی کی دلچسپ داستان ہے۔ مختلف اصناف سخن میں یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی ادبی اہمیت اجاگر کی گئی ہے کہ میر عثمان علی خان کی فیاضانہ سرپرستی، علم دوستی اور قدر افزائی کی وجہ سے ایک قلیل عرصے میں چار ہزار سے زیادہ کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ دیباچے میں ڈاکٹر زور نے وجہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور کتاب کی ترتیب پر اظہار خیال کیا ہے ڈاکٹر زور نے یہ بتایا ہے کہ قطب شاہی سلاطین اور لکھنؤ کے علم دوست حکمرانوں کے عہد میں بھی اُردو کی ہمہ جہتی ترقی نہیں ہوئی تھی جیسی کہ عہد سلطان العلوم میں ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر زور تحریر کرتے ہیں کہ میر عثمان علی خان نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور انھیں منصبوں، عطیوں اور ماہوار رقمی امداد سے سرفراز کیا ہے۔

"عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں میر عثمان علی خان کی اُردو دوستی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ریاست کی مختلف انجمنوں اور

اداروں کی انھوں نے کس طرح حوصلہ افزائی کی ہے۔ اردو رسائل و اخبارات کی امداد ہو یا جامعہ عثمانیہ یا دارالترجمہ کا قیام، سب انھیں کی علم دوستی کی ایسی زندہ مثالیں ہیں جو ان کے نام کو تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ تابندہ رکھیں گی۔ کتاب کے دوسرے حصے میں شعراء اور مصنفین کی انفرادی مساعی ریاست میں اردو زبان کے موقف اور اردو کی ترقی سے متعلق مختلف محرکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کی ابتداء کے بارے میں جو مختلف غلط فہمیاں تھیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ولی اورنگ آبادی کو اُردو شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا تھا اور ولی سے قبل کی ادبی مساعی کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ زبان کے بارے میں یہ غلط نظر دلوں میں گھر کر چکا تھا کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ان تصانیف سے ہوا جو عہد عثمانی میں شائع ہوئیں۔ تحقیق و تدقیق کا ذوق بھی اسی دور کی دین اور اسی علمی فضا کا رہین منت ہے۔ عہد عثمانی کا ایک ادبی کارنامہ یہ بھی ہے کہ ولی کے پیشرو شعراء نے اپنے جو یادگار کارنامے چھوڑے تھے انھیں مرتب و مدون کر کے منظر عام پر لایا گیا جس نے اُردو ادب کی تاریخ کو ماضی میں دور تک آگے بڑھا دیا۔ ڈاکٹر زور نے یہاں اُردو کی پیدائش سے متعلق اپنے مشہور نظریے کو پیش کیا ہے کہ اُردو کا ہیولا مسلمانوں کے فتح دہلی سے پیشتر پنجاب میں تیار ہو رہا تھا۔ یہ برج بھاشا سے اخذ نہیں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ قدیم اُردو اور پنجابی میں بہت زیادہ لسانی اشتراک ہے جس سے مذکورہ بالا نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہ جہان سے پہلے اُردو زبان موجود تھی اور اس میں بیسیوں شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ کتاب کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کی تمام ادبی انجمنوں اور اداروں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے جیسے انجمن ترقی اُردو، مکتبہ ابراہیمیہ، سلسلہ ادبیات اُردو لٹریری اکیڈمی اور مجلس علمیہ وغیرہ

ان تمام اخبارات و رسائل کی بھی فہرست دی گئی ہے جو حیدرآباد سے شائع ہوتے تھے۔ اور یہاں کے عوام و خواص کے ادبی ذوق کی تسکین کا باعث تھے۔ ضمیمہ نمبر ایک میں ایک سو باون شاعروں اور انشاپردازوں کی فہرست دی گئی ہے اور ابجدی ترتیب میں ان کے نام لکھے گئے ہیں۔ "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" سے ریاست حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی مفصل تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔

تذکرہ نگاری کا دور ختم ہونے کے بعد ہماری زبان میں ادبی تاریخیں مرتب کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اس لیے ادبی تاریخوں کو آج بھی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ آج کل ہر موضوع کے اختصاصی مطالعے پر زور دیا جانے لگا ہے اردو ادب میں بھی علاقہ واری ادبی تاریخوں کا رواج عام ہو گیا ہے۔ دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو، اور بمبئی میں اُردو جیسی تصانیف ملک کے خاص خطوں کے ادبی ارتقاء اور نشوونما کی تاریخیں ہیں۔ "دکنی ادب کی تاریخ" بھی اسی نوعیت کی ایک مختصر ادبی تاریخ ہے۔ یہ کتاب ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اس میں اُردو کے قدیم مرکزوں، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ اور رنگ آباد کے شاعروں اور نثر نگاروں کی ادبی خدمات کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ ادبی تاریخ ۱۳۵۰ء تا ۱۷۵۰ء یعنی چار سو سال کے عرصے کو محیط ہے۔ اس تصنیف کے چھ ابواب میں دکن کے مختلف ادبی مرکزوں کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اُردو نظم و نثر کا آغاز دکن میں بہمنیوں کے دور حکومت میں ہو چکا تھا ان کا پایۂ تخت گلبرگہ اور بیدر رہا تھا۔ ڈاکٹر زور کے عہد میں بہمنی (۱۳۵۰ء - ۱۵۲۵ء) کے شعراء و مصنفین کی ادبی کاوشوں کو متعارف کروایا ہے اور ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے لیکن تفصیل کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے۔ اس دور کے شاعروں میں مشتاق، لطفی، فیروز، اشرف، میراں جی شمس العشاق اور سید شہباز حسینی وغیرہ کے کلام کے نمونے اور ان کے مختصر حالات زندگی درج کیے گئے ہیں۔ دوسرا باب عادل شاہی عہد

(۱۴۹۰ء۔ ۱۶۸۶ء) سے متعلق ہے۔ اس باب میں بہمنی دور کے زوال کے بعد دکن کی پانچ سلطنتوں کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر عادل شاہی سلطنت کے حکمرانوں کی ادبی و ثقافتی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے شعراء اور مصنفین کی تخلیقات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی اور عادل شاہ ثانی خود شاعر تھے اور فن کاروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس لیے بیجاپور اہلِ علم و ہنر کا مسکن بن گیا تھا۔ اس دور کے شعرا میں برہان الدین جانم، قطب زاری، مرزا مقیم استرآبادی، حسن شوقی، امین، صنعتی، ملک خوشنود، نصرتی، ہاشمی اور شغلی وغیرہ کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے مرزا مقیم اور مقیمی کو جو علیحدہ ادبی شخصیتیں ہیں ایک ہی شاعر بتایا ہے جو درست نہیں ہے۔ قطب شاہی عہد (۱۵۰۸ء تا ۱۶۸۷ء) کے ادبی اکتسابات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ تہذیب و شائستگی کے فروغ و اشاعت اور فنون لطیفہ و ادب کی سرپرستی کے اعتبار سے قطب شاہی حکمران دکن کی تاریخ میں ایک امتیازی شان کے حامل نظر آتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہان قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے ان کی شہرہ آفاق دولت و ثروت تعمیر کاری اور علم و ادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی اور اردو زبان اور ادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔"

قطب شاہی دور کو تین ادوار میں تقسیم کرکے زوال سلطنت اور سقوط گولکنڈہ تک کی ادبی شخصیتوں کا حال درج کیا گیا ہے۔ "ابتدائی کوششیں" میں سلطان قلی سے لے کر ابراہیم قلی کے دور کو ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے بلکہ مصنف کا خیال ہے کہ اس عہد میں سلطنت کے استحکام اور توسیع کی طرف قطب شاہی حکمراں بہت زیادہ متوجہ رہے۔ ابراہیم کے زمانے میں بعض شعراء گولکنڈہ میں موجود تھے۔ مثلاً ملا خیالی، محمود اور فیروز وغیرہ۔ سلطنت کا زمانہ عروج (۱۵۸۰ء تا ۱۶۷۲ء) علم و ادب اور فنون لطیفہ کی ترقی کا

بھی دور ہے۔ پانچواں حکمراں محمد قلی قطب شاہ خود بلند پایہ سخن گستر اور پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ وجہی، احمد گجراتی، غواصی، عبداللہ، جنیدی اور ابن نشاطی، سلطان میراجی خدانما اور عابد شاہ نے نظم و نثر کی نشوونما میں قابلِ لحاظ حصہ لیا اور ادبی کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ قطب شاہی سلطنت کا دور انتشار (۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۷ء) حیدرآباد میں ادب اور فنون لطیفہ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اورنگ زیب کے حملے کے بعد جب سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو اہل ہنر بھی منتشر ہونے لگے اس زوال کے آثار اس وقت شروع ہو چکے تھے جب اورنگ زیب سے ۱۶۶۶ء میں صلح کے شرائط طے ہوئے تھے چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی ایک نئی مہر "ختم بالخیر والسعادۃ" بنوالی تھی جس سے مراد یہ تھی کہ قطب شاہی سلطنت اب برائے نام باقی رہ گئی ہے دراصل اسکا خاتمہ بالخیر ہو چکا ہے اورنگ زیب کے سفیر قطب شاہیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے اور قطب شاہی بادشاہوں کی آزادی سلب ہو چکی تھی۔ سلاطین قطب شاہیہ کی سرافرازی و کامرانی کے ساتھ فن کاروں کی جودت طبع اور خوش فکری و آسودگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح وہ شعراء جو مثنوی، قصیدہ اور غزل میں طبع آزمائی کرکے شاہی خلعت و انعامات اور اعزاز پاتے تھے اب افسردہ و مضمحل ہو کر مرثیہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ مغل سلطنت کے قیام کے بعد بحری، نوری جیسے شعرا نے حیدرآباد ہی کی سکونت ترک کر دی اور جو بچ رہے تھے وہ سلطنت کی بربادی اور قطب شاہیوں کے زوال سے ایسے دل گرفتہ پریشان اور مایوس تھے کہ اب سوائے مرثیہ گوئی کے ان سے کچھ اور بن نہ پڑتا تھا۔ گولکنڈے کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ جہاں اس نے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں انتقال کیا۔ ان تمام واقعات کو دکن کے شعراء و واقعات کربلا سے نسبت دینے لگے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"فاتح دکن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی اور ان کے کارندوں کی سیاست

کے ڈر سے وہ اپنے جذبات وخیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غمزدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ کر نکالی۔"

اس دور کے مرثیہ نگار شعراء میں روحی، ہاشم علی، نادر، ضعیفی، عشرتی، ذوقی، وجدی اور ولی ویلوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کی ادبی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے ان کے حالات زندگی سے متعلق معلومات بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

"دکنی ادب کی تاریخ" کا آخری باب "دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر" اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس موضوع پر ادبی تاریخوں میں بہت کم اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کے فتح دکن کے بعد جب یہ علاقہ مغلیہ سلطنت میں ضم ہو گیا تو دکن اور شمال کی راہیں کھل گئیں۔ شعراء اور اہلِ علم کو زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا وہ دکن کے اس ادبی سرمائے سے روشناس ہوئے جس میں ہر صنف سخن کے قابل فخر نمونے موجود تھے اس کے برخلاف شمال میں ریختہ بول چال کی زبان تھی اور اسے علمی و ادبی مقاصد کے لیے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہاں جو ایک دو مثالیں ملتی ہیں ان کی بھی اہمیت تذکرہ نویسوں نے یہ کہہ کر گھٹا دی تھی کہ یہ سنجیدہ شاعری کا نمونہ نہیں، بلکہ تفننِ طبع کے لیے منصۂ شہود پر آئے تھے۔ فطرت اور جعفر زٹلی کے کلام کے نمونے دے کر ڈاکٹر زور نے اس عہد کے طرزِ فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فارسی میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء اب اس زبان سے اکتا گئے تھے کیونکہ پہلے تو انھیں زبان سیکھنے میں خاصی دشواری پیش آتی تھی دوسرے اس میں کمال حاصل کرنا اور فارسی شعرا دشاعروں سے مسابقت کرنا آسان نہ تھا اس لیے وہ رفتہ رفتہ اردو کی طرف توجہ منعطف کرنے لگے۔ ایک اور بات یہ تھی کہ فارسی شاعری کی قدر کرنے والی حکومتیں اب مائل بہ زوال ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے ولی کے سفرِ دلی کی اہمیت بھی واضح کی ہے

میر حاتم اور آبرو وغیرہ کے ولی سے متاثر ہونے اور ان کا تتبع کرنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ تبلایا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتداء کا محرک ولی کے شگفتہ و معنی آفریں کلام اور دکن کے ادبی ورثے سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر زور کی یہ ادبی تاریخ مختصر ہے لیکن ہر دور کے اہم شاعروں اور ان کی تصانیف کا ذکر اس میں موجود ہے یہ ادبی تاریخ ضروری معلومات سے پُر ہے لیکن اس میں کہیں کہیں انتہائی ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ خود مصنف لکھتے ہیں:

"اس چھوٹی سی کتاب کو دکنی ادب کی تاریخ پر حرفِ آخر نہیں سمجھنا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے ذریعے سے اس خطہ ملک کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کروانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب محققوں کے لیے نہیں، بلکہ طلبا اور عوام کے لیے ہے۔"

حیدرآباد کے نامور شعراء کو عوام سے متعارف کروانے کے لیے ڈاکٹر زور کی تجویز یہ تھی کہ ان کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ کلام کا عمدہ انتخاب شائع کیا جائے "کیف سخن"، "رمز سخن"، "فیض سخن"، "بادہ سخن"، اور "متاع سخن" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ "کیف سخن" میں سید رضی الدین حسن کیفی کے کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے۔ اس کے مقدمے میں پہلے دکن کی اردو شاعری کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر "کیفی اور ان کی شاعری" کے زیرِ عنوان کیفی کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور شاعری کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے، ڈاکٹر زور نے کلام کیفی کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"کیفی کی شاعرانہ زندگی کا تیسرا دور استاد داغ کی شاگردی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس وقت ان کی فطرت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے داغ کی صحبت نے ان کے طبعی رجحانات کو پختہ کر دیا۔"

انتخاب کلام میں غزلوں، رباعیات اور اہم نظموں کو جگہ دی گئی ہے۔ طغیانی رود موسی

(۱۳۲۶ھ)، "جاپان کا پیغام" "حیدر آباد"، "قرض حسنہ" اور "غروب آفتاب" ان کی مقبول نظمیں ہیں۔ ایک سو بائیس صفحات میں رضی الدین حسن کیفی کے کلام کا اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ "کیف سخن" ۱۹۳۵ء میں اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

"بادۂ سخن" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔ مائل کی شاعری اپنی سادگی و بے ساختگی اور دلکشی کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے مقدمے میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ "بادۂ سخن" کے لیے ڈاکٹر زور نے شاعر کا ایسا کلام منتخب کیا جو ان کے رنگِ سخن کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

"رمز سخن" کی اشاعت کا مقصد بھی دکن کے ایک خوش گو شاعر اور اس کے کلام کو متعارف کروانا تھا سدانند جوگی، بہاری لال رمز اپنے عہد کے ایک معروف شاعر تھے۔ جن کا زمانہ ۱۲۴۰ھ تا ۱۳۲۵ھ ہے۔ مقدمہ میں دکن کی اردو شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے اس کے بعد شاعر کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے مختلف ماخذوں سے مدد لی ہے۔ رمز کی شاعری کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ رمز فیض کے فیضانِ صحبت کا ایک خاص نمونہ تھے۔ انھوں نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنے استاد کا ذکر کیا ہے ؎

رمز کے ہیں پیر و مرشد میر شمس الدین فیض
فیض یاب اس فیض سے سارا زمانہ ہو گیا

رمز تمام زندگی استاد کی محبت کے گیت گاتے رہے اور ۱۴ رجب ۱۳۲۵ھ کو عرس فیض کے دن مشاعرے میں استاد کی قبر پر غزل سناتے ہوئے آخری سانس لی اور بقول ڈاکٹر زور "فنا فی الاستاد" ہو گئے۔ اس واقعے کو ترک علی شاہ ترکی نے اپنے "تذکرہ شعراء فارسی" موسوم بہ سخنوران چشم دیدہ" میں قلمبند کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ان کی

لاش کے ہندو اور مسلمان دونوں دعویدار تھے اور اپنے اپنے طریقہ سے ان کی آخری رسومات انجام دینا چاہتے تھے۔ انتخاب میں اڑتیس غزلوں، تراسی رباعیات، چوبیس خمسہ جات اکیس قطعات اور پانچ قصائد کو جگہ دی گئی ہے۔

"مرقع سخن" کی جلد دوم ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۷ء میں مرتب کی تھی یہ کتاب بھی ادارہ ادبیات اردو کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے ادارے کے مدیر عمومی ڈاکٹر زور نے مرتب و مدون کر کے شائع کیا ہے "مرقع سخن" کی پہلی جلد حیدر آباد کے شعرائے آصفیہ کا بالتصویر تذکرہ ہے جسے آصف سابع کی حکومت کے پچیس سال مکمل ہونے پر "جشن سیمیں" کی تاریخوں میں شائع کیا گیا تھا اور پچیس سالہ جوبلی کی مناسبت سے اس میں پچیس منتخب ادبی شخصیتوں کے حالات اور کلام پر تبصرے کو جگہ دی گئی تھی لیکن "مرقع سخن" جلد دوم میں مزید پچاس شعرا کے حالات زندگی اور ان کا نمونۂ کلام درج کیا گیا ہے۔ یہ التزام رکھا گیا ہے کہ خانوادۂ آصفی کے ان اراکین پر علیحدہ مضامین لکھے جائیں جنھوں نے شعر و ادب کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور فارسی اور اردو میں شعر گوئی کی ہے۔ چنانچہ "مرقع سخن" جلد دوم میں آصف جاہ اول، ناصر جنگ شہید، آصف جاہ سادس، سلطان العلوم آصف جاہ سابع، نواب اعظم جاہ بہادر معظم جاہ بہادر شجیع اور دوسرے آصف جاہی خاندان کے اراکین کا کلام بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ قطب شاہی عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات پر بعض تذکرے اور تصانیف موجود ہیں جیسے "اردو شہ پارے" "اردوئے قدیم" "محبوب الزمن" اور "یورپ میں دکنی مخطوطات" وغیرہ لیکن عہد آصف جاہی کے فن پاروں پر کوئی مستقل اور مبسوط کتاب موجود نہیں اور اس کمی کو سلسلۂ ادبیات اردو کی اس تصنیف میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "مرقع سخن" کی پہلی جلد میں آصف جاہی دور کے شعرا کو ان کے کلام اور رجحانات کے اعتبار سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا تھا لیکن "مرقع سخن"

کی جلد دوم کا پانچواں دَور دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا دَور ۱۱۵۰ھ، تا ۱۲۰۰ھ اور دوسرا ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک، تیسرا ۱۲۲۵ھ سے ۱۳۰۰ھ تک چوتھا ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۲۰ھ تک اور پانچواں ۱۳۲۰ھ تا ۱۳۵۵ھ ہے پانچویں دَور کے دوسرے حصّے "نوجوان شعراء" میں حیدر آباد کے ان شاعروں کی تخلیقات کو متعارف کروایا گیا ہے جو جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے شاہی خاندان کے نوجوان شعراء اور اس کے بعد کاظم، اقدس اور عباس علی خان لمعہ کے واقعات زندگی اور ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

"مرقع سخن" کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مختلف شعراء کا حال مختلف مصنفین سے لکھوایا گیا ہے مثلاً شاہ خاموش پر قطب الدین صابری، محویر صاحبزادہ میکش، یاس پر ڈاکٹر زور، آشفتہ پر خلیق احمد اور داؤد پر اشفاق حسین نے ایسے مضامین لکھے ہیں، جن میں حیات اور ادبی کارنامے دونوں کا احاطہ کیا گیا ہے تمام مضمون نگار جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل یا متعلم ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر زور تحریر کرتے ہیں:

"اس مرقع کے جملہ مضمون نگار جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ یا متعلم ہیں اور سلسلۂ ادبیات اُردو کے ممد و معاون ہیں اس دفعہ بھی مضامین میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شاعر کی سوانح زندگی کے ساتھ اس کا تھوڑا بہت کلام بھی پیش جائے تاکہ دکن کے گذشتہ دو سو سال کے اُردو شاعروں کا ہر رنگ کا کلام پیش نظر ہو جائے۔"

یہ ضخیم کتاب چار سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے ڈاکٹر زور نے اسے مرتب کر کے ان نقادوں اور محققین کے لیے اہم مواد فراہم کر دیا ہے جو حیدر آباد میں اُردو ادب کی نشو نما کا غائر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

میر شمس الدین فیض اپنے عہد کے ایک مسلم الثبوت استاد سخن تھے وہ ایک لغت نویس اور بلند مرتبہ شاعر ہی نہیں علم عروض کے ماہر بھی تھے۔ فیض اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

اور شاعری میں اپنے منفرد طرز ادا کی وجہ سے حیدر آباد میں ان کی حیثیت ایک خاص دبستان شاعری کے بانی کی سی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر زور نے "فیض سخن" کے نام سے ان کے کلام کے ایک عمدہ انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا ہے اور مقدمے میں بڑے بصیرت افروز انداز میں ان کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں۔ اور خصوصیات کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ "انتخاب کلام" میں غزلوں کے علاوہ فیض کی مثنویاں اور دوسرے اصناف سخن کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے فیض کی متصوفانہ شاعری پر بطور خاص روشنی ڈالی ہے "فیض سخن" کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد اور سراج اورنگ آبادی کے بعد اُردو شاعری میں تصوّف و عرفان کے مسائل سے ایسی وابستگی رکھنے والی شخصیت فیض ہی کی تھی۔

"متاع سخن" نواب عزیز جنگ عزیز کے کلام کا انتخاب ہے۔ عزیز داغ کے شاگرد اور حیدر آباد کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کے کلام میں زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ لطیف انسانی جذبات کی پر اثر مصوّری بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر زور نے "متاع سخن" کے مقدمے میں ان کی شاعری پر ایک جامع تبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔ شاہد احمد نے رسالہ "ساقی" فروری ۱۹۳۷ء میں متاع سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"یہ انتخاب نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ ہے۔ عزیز حیدر آبادی کا شاعرانہ ذوق دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں جگہ لی تھی اور میر انیس مرحوم کس لیے حیدر آباد تشریف لے گئے تھے اگر میں عزیز کے احوال سے بے خبر ہوتا تو بلا مبالغہ یہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے الگ ہو کر مرزا داغ کی زبان میں بول رہا ہے۔"

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈے کا پانچواں جلیل القدر فرماں روا ضرور تھا لیکن ادب میں اس کی بادشاہت کو تسلیم کروانے کا سہرا ڈاکٹر زور کے سر ہے۔ انھوں نے ادب

کی قلمرو میں محمد قلی کی تاجپوشی کی اور اس کا سکّہ چلایا۔

دکنی تحقیق میں کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" غالباً وہ پہلی کتاب ہے جس کا مقدمہ اتنا طویل وبسیط اور مفصل ہے۔ "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" کی تدوین کا کام اتنا اہم ہے کہ اگر ڈاکٹر زور صرف یہی کارنامہ انجام دیتے بھی تو ان کا نام دکن کی تحقیق کے سلسلے میں ناقابل فراموش بن جاتا۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے صرف محمد قلی قطب شاہ کے حالات اور کلام پر روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ اُس دَور کی تاریخ، تہذیب، رسم ورواج طرزِ معاشرت، عمارات، کھیل کود اور دیگر تفریحات وتقاریب کو زندہ کر دیا ہے۔ محمد قلی کے کلام کی ایڈیٹنگ بھی انھوں نے بڑی توجہ اور جانفشانی سے کی ہے اور داخلی وخارجی شہادتوں کی مدد سے مستند مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ عبدالمجید صدیقی نے ڈاکٹر زور کے تاریخی شعور کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ کلیات دکنی زبان کا شاہکار ہے۔ اس میں آندھرا پردیش کی سیاست و معاشرت کی حسین تصویریں موجود ہیں اور اگر اہم اس کلیات کو آندھرا پردیش کی زندگی کا مرقع کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔"

حقیقت یہ ہے کہ "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" کی تدوین ڈاکٹر زور کا ایک یادگار علمی کارنامہ ہے۔ ولی کی اُردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا اور وہ اُردو شاعری کے بادا آدم کہلاتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے "رسالہ اُردو" ۱۹۲۲ء میں محمد قلی کی شاعری پر ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا لیکن اس اوّلین شاعر کے مفصل حالات زندگی اور شاعری پر ایک مبسوط کتاب تحریر کر کے عوام سے اسے روشناس کروانے کا اہم کام ڈاکٹر زور نے انجام دیا۔ ایک ضخیم مقدمہ لکھ کر ڈاکٹر زور نے اس عہد کے تاریخی و ثقافتی پس منظر اور قطب شاہی سلطنت کے تمدن کو ہمیشہ کے لیے ادب کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے یہ کلیات کتب خانہ سالار جنگ کے دونوں نسخوں

کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ لیکن کلیات محمد قلی قطب شاہ کا وہ قدیم نسخہ جو کسی وقت کتب خانۂ آصفیہ کی زینت تھا اور جو بعد میں آصف سابع کے کتب خانے میں پہنچ گیا تھا، تدوین کے وقت ڈاکٹر زور کے پیش نظر نہیں تھا۔ عبدالحق نے اسی مکمل اور قدیم دیوانوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے محمد قلی کی شاعری پر مضمون لکھا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کی مشہور غزل ؎

پیاباج پیالہ پیا جائے نا
پیاباج یکتل جیا جائے نا

کتب خانہ سالار جنگ کے دونوں نسخوں میں موجود نہیں ہے صرف مولوی عبدالحق کے مضمون میں اس کا حوالہ موجود ہے۔ ڈاکٹر زور کی اس سلسلے میں بہت ہی اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اس شاعر کے حالات زندگی کو اس کے تاریخی وثقافتی پس منظر میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور تدوین متن کے فرائض بڑے سلیقے کے ساتھ انجام دیئے ہیں۔ اس مقدمے میں ڈاکٹر زور نے بعض ایسے واقعات بھی قلمبند کیے ہیں جن سے مورخین کو اختلاف ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھاگ متی ایک نزاعی شخصیت ہے۔ ہمعصر تاریخوں میں بھاگ متی کا ذکر موجود نہیں اس کے برخلاف مغل مورخوں نے بڑے مبالغے کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے جسے ہارون خان شیروانی نے ان کے "سیاسی تعصب" اور "علاقہ واریت" کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح شہر حیدرآباد کے نام کے بارے میں بھی جو معلومات فراہم کی گئی ہیں انھیں بھی بعض مورخین درست نہیں سمجھتے۔

ڈاکٹر زور نے محمد قلی کے کلام کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے اس کی زبان چار سو سال سے زیادہ قدیم ہے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا مشکل ہے اس دشواری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر زور نے قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی قلمبند کر دی ہے جس سے قاری کو محمد قلی قطب شاہ کا کلام سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں

معتد بہ تعداد ان الفاظ کی ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں ان تت سم اور تت بھو الفاظ کے معنے کہیں کہیں درست نہیں ۔

ڈاکٹر زور کی اس سعی بلیغ اور تحقیقی کاوش کی داد دینی پڑتی ہے کہ کتنی عرق ریزی اور تلاش و جستجو کے بعد انھوں نے ایک فرمانروا کے ساتھ اس کے عہد کو بھی از سر نو زندگی عطا کی ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ کے اس ضخیم کلیات میں غزلیات کے علاوہ قصائد، مثنویاں، مرثیے اور رباعیاں بھی موجود ہیں جن سے ان کی شاعری کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے طرز ادا کی دلکشی اور اس کی مرنجاں مرنج طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ہم اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتے ہیں کہ دکن میں مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ تھا ۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمے میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے ہندوستانی مزاج اور اس کے مقامی رنگ کی نشان دہی کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اس کی شاعری اپنے عہد کی سچی ترجمان ہے اور اپنے ثقافتی ماحول کی حقیقی نمایندگی کرتی ہے ۔ ڈاکٹر زور نے تدوین و ترتیب کے دوران مختلف موضوعات پر کہی ہوئی نظموں کو جو مخطوطے میں بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں یکجا کر کے انھیں سرخیوں سے مزین کر دیا ہے ۔ مذہبی تقاریب تہذیبی امور، کھیل کود اور تفریحات سے متعلق نظموں نے اپنی مخصوص سرخی کے تحت دیوان میں مناسب جگہ پائی ہے اس سے ایک سہولت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ہر موضوع پر کہی ہوئی تمام نظمیں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں اور اس طرح کلیات میں انتشار کے بجائے ترتیب پیدا ہوگئی ہے ۔ شاعر نے اپنی حیات معاشقہ کی بھی چلتی پھرتی تصویریں اپنے کلام میں پیش کر دی ہیں ۔ کہیں سانولی سے خطاب کیا ہے تو کہیں ننھی اور کونلی سے ہم کلام ہے ۔ محمد قلی کی بارہ پیاریوں سے متعلق نظموں کو بھی ڈاکٹر زور نے یکجا کر دیا ہے ۔ مقدمے میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ

کی شاعری کی اہم خصوصیات سے بحث کی ہے اور اس کے انفرادی خد و خال اُجاگر کیے ہیں کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور کی ایک ایسی یادگار تصنیف ہے جو تاریخ ادب اُردو میں ان کے نام کو ہمیشہ تابندہ رکھے گی اس کی اہمیت دستاویزی ہے اور اس کے مطالعے کے بغیر کوئی شخص تاریخ ادب اُردو سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ یہ کتاب ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی ۔

"کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے جس میں مرتب متن کی حیثیت سے بھی ان کی ادبی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہیں ۔ اس کے مقدمے میں ڈاکٹر زور نے نہ صرف شاعر کے حالات زندگی کے تمام گوشوں پر بخوبی روشنی ڈالی ہے بلکہ حیدرآباد کی قدیم ثقافت کا بھی ایک پُراثر مرقع کھینچا ہے جس میں قدیم شہر حیدرآباد کی آرائش و زیبائش یہاں کے تہواروں، عیدوں، رسوم و رواج اور ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے چونکہ زیر بحث شاعر اس عہد کی ایک اہم تاریخی اور سیاسی شخصیت بھی تھا ۔ اس لیے اس بادشاہ کے دور حکومت کا تاریخی اور سیاسی پس منظر بھی مختلف قدیم تواریخ کی مدد سے پیش کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر زور نے نو قلمی اور سترہ مطبوعہ تواریخ سے معلومات اخذ کی ہیں ۔ ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور اس عہد کے ثقافتی اور تاریخی امور پر روشنی ڈالتے ہوئے اکثر جگہ ابوالقاسم فرشتہ کے بیانات کو بنیاد بنایا ہے ۔ فرشتہ کی تاریخ دانی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا مورخ ہے جو تاریخ نویسی میں ہر ماخذ سے حاصل ہونے والی معلومات سے جن میں روایات اور افواہوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے کام لینا چاہتا ہے ۔ فرشتہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس نے تاریخ نویسی میں واقعات کی صداقت اور مستند ماخذوں پر اپنے تخیل کی بلند پروازی کو ترجیح دی ہے ہم فرشتے کی وسیع و ہمہ گیر معلومات اور اس کی قوت آخذہ کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن تاریخ نویسی میں" بڑھا دیا ہے فقط

زیبِ داستان کے لیے کار رجحان سودمند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تاریخ حق گوئی اور صداقت پسندی کی خواہاں ہوتی ہے۔ دراصل فرشتے نے گولکنڈہ یا نئے بسائے ہوئے شہر حیدرآباد کی سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کی معلومات سماعی اور قیاسی تھیں۔ حد یہ ہے کہ فرشتہ محمد قلی قطب شاہ کے صحیح نام سے بھی ناواقف ہے ایسے مورخ کے بیانات کو درخورِ اعتنا سمجھنا زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

"حیات محمد قلی قطب شاہ" میں ڈاکٹر زور نے اردو کے اس پہلے صاحبِ دیوان شاعر کے مفصل حالات زندگی قلمبند کیے ہیں اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تصنیف میں شاعر سے متعلق نئی معلومات پیش نہیں کی گئی ہیں بلکہ "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" کے مقدمے میں ڈاکٹر زور نے شاعر کے عہد اور واقعاتِ زندگی کے بارے میں قدیم ماخذوں سے استفادہ کرتے ہوئے جن امور پر روشنی ڈالی تھی "حیات محمد قلی قطب شاہ" میں ان کی تکرار نظر آتی ہے۔

"حیات میر محمد مومن" ڈاکٹر زور کی تاریخی اور نیم سوانحی تصنیف ہے جو حیدرآباد کے شاندار ماضی کو تھوڑی دیر کے لیے قاری کی نظروں کے سامنے متحرک کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے بڑی تحقیق اور جستجو کے ساتھ ان کے حالات زندگی فراہم کیے ہیں اور ان کے ناقابلِ فراموش کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ "حیات میر محمد مومن" اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ میر مومن پیشوائے سلطنت قطب شاہی تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے شہر حیدرآباد کی تعمیر اور شہری منصوبہ بندی کا اہم کام انجام دیا تھا۔ میر مومن اپنے وقت کے عالم متبحر، آرکیٹکٹ، معلم اور سیاست دان تھے۔ شہر حیدرآباد کی تعمیر اور صورت گری اور قطب شاہی سلطنت کے فروغ و استحکام میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر زور نے میر مومن کے خاندانی حالات ان کے نام و نسب، ولادت، تعلیم و تربیت، ایران سے ہجرت، دکن میں ان کی آمد اور قیام

حیدرآباد کے متعلق مستند ماخذوں سے مواد اکٹھا کر کے معلومات فراہم کی ہیں۔ دوسرے حصے میں جو اکتیس صفحات پر مشتمل ہے میر مومن کی خدمت پیشوائی، شہر حیدرآباد کی تعمیر، سلطان محمد قطب شاہ کی پیدائش اور حیات بخشی بیگم کی شادی جیسے تاریخی واقعات پر بڑے اعتماد کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ تیسرے باب میں ان مساجد، سرائے، عاشور خانوں، کتبات اور تالابوں وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو رفاہِ عام کے لیے میر مومن نے شہر سے باہر تعمیر کروائے تھے۔ میر مومن نے بہت سے دیہات بھی بسائے اور وہاں مسجدیں اور عاشور خانے تعمیر کروا کے عوام کو مذہب سے قریب لانے کی کوشش کی۔ اس تصنیف کا چوتھا حصہ تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ اس عہد کے تاریخی اور ثقافتی رجحانات سے ہمیں روشناس کرواتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی، شاہ ایران سے بادشاہ کے سفارتی تعلقات، اراکین سلطنت کے انتخاب، منشی الملک، پیشوا اور سرخیل اور دوسرے عہدیداروں کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں حصہ میر محمد مومن کی خانگی اور نجی زندگی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس نامور تاریخی شخصیت کے حالات بڑی چھان بین اور تحقیق کے بعد اکٹھا کیے ہیں اور ایک معتبر سوانح نگار کی طرح ان کی شخصیت و سیرت کردار اور مصروفیات وغیرہ کی تفصیل بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی ہے۔ ماضی میں چار سو سال پیچھے چھلانگ لگا کر ایسی مفید اور مستند معلومات مہیا کرنا ڈاکٹر زور جیسے محقق ہی سے ممکن تھا۔ چھٹے حصے میں میر مومن کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ "رسالہ مقداریہ" کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ میر مومن نے میل و فرسخ، درہم اور مقدار کے پیمانے کس حسن تدبیر اور ذہانت کے ساتھ مقرر کر رکھے تھے۔ ان کے فارسی دیوان سے قصائد کے نمونے اور تاریخی قصائد کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ میر مومن نے قصائد کے علاوہ غزل اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ساتواں حصہ چھٹے حصّے کا تسلسل معلوم ہوتا ہے ۔ اور اس میں میر مومن کے اخلاق وعادات ان کی فیض رسانی، علم وفضل، زہد وتقویٰ علم نجوم سے دلچسپی اور کرامات وغیرہ کا مفصل بیان درج کیا گیا ہے۔ آٹھواں حصہ اس بلند مرتبت شخصیت کے پسماندگان کے ذکر پر مشتمل ہے اور آخری حصّے میں جس کا عنوان "دائرہ" ہے، اس گورستان کا حال بیان کیا گیا ہے جسے دائرہ میر مومن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دسواں حصّہ کتاب کا آخری باب ہے جس میں ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔ تین سو تیرہ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جو محققین عہد محمد قلی قطب شاہ پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے کتاب میں چونتیس تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس کتاب کا مواد ڈاکٹر زورؔ نے قدیم قطب شاہی تواریخ اور جدید تاریخوں سے اکٹھا کیا ہے۔ گلزار آصفیہ، محبوب الزمن، حدائق السلاطین، حدیقۃ العالم، تاریخ عالم آرائے عباسی، تواریخ دربار آصف، تاریخ محمد قطب شاہ، تاریخ گولکنڈہ، ماہنامہ، برہان ماثر اور گلزار ابراہیمی جیسی قدیم تواریخ سے ضروری معلومات فراہم کرکے اپنی اس کتاب کو ڈاکٹر زورؔ نے ایک مستند تاریخی تصنیف بنا دیا ہے یہ ڈاکٹر زورؔ کی ایک قابلِ قدر اور وقیع علمی کاوش ہے۔

ادارۂ ادبیات اُردو کے قیام کے ساتھ ہی ایک موزوں کتب خانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ ڈاکٹر زورؔ نے مخطوطات اور کتابیں جمع کرنے کے لیے بڑے جتن کیے تھے حیدرآباد کی بعض ذی حیثیت اور ذی علم شخصیتوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنے قدیم مخطوطات اور نادر مطبوعات بطور عطیہ ادارے کے حوالے کردیں اور اس سلسلے میں انھوں نے "بے خودی وہوشیاری" دونوں سے کام لیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ایک قلیل عرصے میں ادارے کے کتب خانے میں مخطوطات اور مطبوعات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ ڈاکٹر زورؔ کی زندگی تک عطیات کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا اور

اب بھی اہلِ قلم حضرات حسبِ توفیق اپنی تصانیف ادارے کی نذر کرتے رہتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانے میں اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے مخطوطات بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ہندی، سندھی اور پنجابی وغیرہ میں لکھی ہوئی کتابیں بھی اس کتب خانے کی زینت ہیں۔ مطبوعہ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی فہرست تین جلدوں میں شائع کی جاچکی ہیں۔ ادارے میں جو بیاضیں اور قلمی کتابیں ہیں اُن کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت تھی اس قسم کی وضاحتی فہرست (Descriptive Catalogue) تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر مخطوطے کے متعلق صحیح معلومات اور اس کے شاعر یا مصنف اور نفسِ موضوع وغیرہ سے بخوبی واقفیت کے بغیر اس طرح کی فہرستیں منصۂ شہود پر نہیں آسکتیں۔ اس کام میں نہ صرف عرق ریزی اور دقت نظر کی ضرورت ہے بلکہ ہر مخطوطے کی خصوصیات اس کے عہد کے تعین شاعر و مصنف کے نام و تخلص اور موضوع کی وضاحت کے کام میں بھی خاصہ وقت صرف ہوجاتا ہے اور بغیر تحقیقی شعور وآگہی اور وسیع وہمہ گیر ادبی معلومات کے اس کام میں کامیابی ممکن نہیں۔ پانچ جلدوں میں مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں مرتب کرکے اُردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کی راہ میں مشعلیں روشن کردی گئی ہیں۔ دکنی ادب پر کام کرنے والا کوئی محقق ڈاکٹر زورؔ کی ان فہرستوں سے استفادہ کیے بغیر صحیح راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ ان سے محققین کی اچھی رہبری ہوتی ہے ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یوں تو مختلف کتب خانوں کی فہرستیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ نے جس تفصیل اور تحقیقی بصیرت اور عالمانہ انداز میں انھیں مرتب کیا ہے اس کی مثال کم ملے گی ۱۹۶۰ء میں ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی جس میں اپنے تین سو مخطوطات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ان میں سے کچھ مخطوطات نادر ہیں دوسرے کتب خانوں میں ان کے نسخے یا نقلیں موجود نہیں ہیں۔ پچاس مخطوطات ایسے ہیں

جنھیں شعراء اور مصنفین نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا ان پر اُن کے دستخط موجود ہیں۔ ان میں سے کئی مخطوطات زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں ہر درجہ اور حیثیت کی ادبی شخصیتوں کی یادگاریں موجود ہیں اور یہ صرف حیدرآباد یا جنوبی ہند ہی کے قلمکار نہیں بلکہ دور دراز مقامات جیسے دلّی، آگرہ، لکھنؤ، رام پور، بریلی، قنوج، لاہور اور کلکتہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اور انھیں بڑی مشکل سے حاصل کیا گیا ہے بعض مخطوطات اپنے عہد کے حکمرانوں کا نتیجۂ فکر ہیں اور ان کی اہمیت تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی۔ جلد اوّل میں قدیم ترین شعراء کی قلمی کتابوں کا تعارف بھی کروایا گیا ہے اور دورِ مابعد کی تصانیف کا بھی یعنی ۱۴۲۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیانی عہد سے متعلق مخطوطات کا جو تقریباً پانچ سال کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں، وضاحتی بیان قلمبند کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں: اس تذکرے میں مخطوطات کی فہرست نہ تو سنہ وار قائم رہ سکی اور نہ بلحاظ موضوع کیونکہ ایک ایک جلد میں ایک ہی کاتب اور ایک ہی زمانے کی لکھی ہوئی دو دو تین تین کتابیں شامل ہیں اس لیے ڈاکٹر زورؔ نے آخر میں "مخطوطات کی فہرست بلحاظ زمانہ تصنیف" بھی شامل کر دی ہے۔ ان قدیم و نایاب ادبی کاوشوں میں ڈاکٹر زورؔ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اُردو داں طبقے کو متعارف کروایا ہے اس جلد میں عطیۂ دہندگان کے ناموں کی فہرست بھی موجود ہے اور اشخاص کتب اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ بھی جس سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تذکرہ اُردو مخطوطات کی پہلی جلد ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔

"سرگذشت حاتم" جون ۱۹۴۴ء میں ادارہ ادبیات اُردو سے شائع ہوئی یہ کتاب دراصل شاہ ظہور الدین حاتم کے "دیوان زادہ" کا مقدمہ ہے"۔ دیوان زادہ کی اشاعت میں تاخیر کے پیش نظر اس کے مقدمے کو ایک علٰحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے اس دیباچے کا ایک حصّہ ڈاکٹر زورؔ نے لندن اور پیرس کے قیام

کے دوران مکمل کر لیا تھا اور اسے رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع کر دیا گیا تھا یہ اس قدر مقبول ہوا کہ ملک کے نامور ادیبوں نے ڈاکٹر زورؔ سے "دیوان زادہ" مرتب کر کے طبع کرنے کی خواہش کی۔ ڈاکٹر تاراچند اور اصغر گونڈوی کے اصرار پر ڈاکٹر زورؔ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ کام تعویق میں پڑ گیا اس کتاب کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے حاتم کی زندگی کا مطالعہ کیا تو وہ ان کی صوفی منشی، بے ریائی اور خوش خلقی، سادگی اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر زورؔ نے اس استاد الاساتذہ کے حالاتِ زندگی ان کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں کو اُردو داں طبقے سے اس لیے روشناس کروانے کی کوشش کی ہے کہ حاتم شمالی ہند کے وہ اوّلین شاعر ہیں جنھوں نے دیوان ولی کے مطالعے کے بعد فارسی گوئی ترک کر کے اُردو زبان میں طبع آزمائی کی تھی اس کے بعد وہ تمام زندگی اُردو میں شعر کہتے رہے اور ستر برس اسی زبان میں مشقِ سخن کی۔ ڈاکٹر زورؔ سے پہلے "آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد نے حاتم کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کو پیش کیا تھا اور اس کے بعد حسرت موہانی نے "اردوئے معلیٰ" (نومبر ۱۹۰۹ء) میں حاتم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی غزلوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا تھا ڈاکٹر زورؔ کو لندن میں حاتم کے "دیوان زادہ" کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ اس دیوان کی ایک انوکھی خان یہ ہے کہ شاعر نے اُسے ۱۱۷۹ھ میں خود تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں:

"اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان اُردو کے درجہ بدرجہ ارتقاء لفظوں اور ترکیبوں کی تبدیلیاں اور محاورے اور لب و لہجے کے اختلاف تاریخ وار مندرج ہوئے ہیں یہ ایک ایسا کم یاب گنجینہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو

ہندوستانی زبان کی لسانی ساخت پر غور و خوض میں مصروف ہیں"۔

ڈاکٹر زور کو حاتم کے حالات زندگی سے متعلق مواد بھی یورپ ہی میں دستیاب ہوا تھا۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ "آبِ حیات" کے مصنف محمد حسین آزاد کی نظر سے حاتم کا "دیوان زادہ" تو کیا غالباً کوئی اور دیوان بھی نہیں گذرا تھا۔ "دیوان زادہ" میں ڈاکٹر زور نے حاتم کے حالات زندگی بڑی محنت سے اکٹھا کیے ہیں اور مستند سنین کے ساتھ واقعات حیات تحریر کیے ہیں اور انھوں نے آزاد کے بتائے ہوئے سنہ کو غلط ثابت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ حاتم نے سترہ سال کی عمر میں بھی ۱۱۲۸ھ میں شاعری کی ابتدا کی تھی اس میں شبہ کی گنجایش اس لیے بھی نہیں کہ حاتم نے خود اپنے ہاتھ سے دیوان زادہ تحریر کیا تھا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور کی اچھی تحقیقی صلاحیتیں بروے کار آئی ہیں ڈاکٹر زور نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ولی کے دلی پہنچنے سے پہلے ہی وہاں ان کی غزلوں کا چرچا عام ہو گیا تھا اس کے ثبوت میں انھوں نے "دیوان زادہ" کی ایک ایسی غزل پیش کی ہے جو ۱۱۳۱ھ میں ولی کی زمین میں لکھی گئی تھی جس کا مطلع ہے ؎

تاباں ہے اس نگہ سے میرے دل میں نور آج

(دیوان زادہ غزل نمبر ۷)

لیکن یہ غزل شاید بعد میں ناپید ہو گئی تھی کیونکہ جب احسن مارہروی نے انجمن ترقی اردو سے حاتم کا کلیات شائع کیا تو اس میں یہ غزل موجود نہیں تھی۔ ولی کو حاتم اپنا استاد تصور کرتے تھے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں ان کا یہ کہنا کہ:

"در شعر فارسی بطرز مرزا صائب و در ریختہ بطور ولی رحمہم اللہ اوقات بسر می کرد و ہر دو را استاد می داند"

حاتم کا ولی کی زمینوں میں تیرہ غزلیں کہنا ان سے اثر پزیری کا غماز ہے۔ ڈاکٹر زور نے حاتم کی ملازمت اور دیگر واقعات زندگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مختلف

تذکروں کی تائید و تردید میں مدلل ثبوت فراہم کیے ہیں اور اپنے موضوع کی تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے حاتم کا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ بتایا ہے اور انھیں سہروردی سلسلے کا صوفی تحریر کرتے ہیں ان کے احباب میں ہدایت، علی ضمیر، فغان اور میر اسلم وغیرہ کے نام بتائے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے حاتم اور ان کے ہمعصروں کی باہمی چشمک کے دلچسپ واقعات بھی مستند حوالوں سے درج کیے ہیں۔ میر محمد شاکر ناجی سے ان کی معاصرانہ چشمک رہی تھی۔ ناجی حاتم کی شہرت و ہر دل عزیزی سے خوش نہ تھے۔ انھوں نے ہجویہ اشعار میں دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ ان دونوں شاعروں کے درمیان جو ادبی معرکہ آرائی ہوئی تھی اس کا سلسلہ بارہ سال تک جاری رہا لیکن حاتم عفو و درگذر کے قائل تھے اس لیے انھوں نے ناجی کا جواب بڑی متانت اور دوستانہ انداز میں دیا ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں شاعرانہ تعلّی سے باز نہ رہ سکے ہیں ؎

سخن میں فخر اپنا بن کہے رہتا نہیں ناجی
اُسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہ کے

میر تقی میر بھی ناجی کی طرح حاتم کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ "نکات الشعراء" "گل رعنا" اور دوسرے تذکروں کے بیانات کے پس منظر میں ڈاکٹر زور نے ان دونوں باکمال شاعروں کی نوک جھونک کا ذکر کیا ہے سودا کے مقابلے میں میر اپنی استادی کا دعویٰ کرنے لگے تھے لیکن حاتم انھیں اپنا نو عمر معاصر اور خورد سمجھ کر خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن بعض معترضین کا دندان شکن جواب اپنی مشہور غزل میں دیا ہے جس کا مقطع ہے ؎

وہی ہیں ریختہ کے فن میں استاد
جو ہیں گے آشنا حاتم کے فن سے

ایک اور غزل میں تو انھوں نے میر پر علانیہ چوٹ کی ہے اور کہتے ہیں ؎

تھا ابھی ہم پاس ابھی جاتا رہا اوروں کے پاس
آشنائی میں وہ لڑکا گنجنے کا میر ہے

ڈاکٹر زور نے حاتم کی غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی نظر سے بڑی دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا ہے تحریک ایہام گوئی میں حاتم کا حصہ اور پھر ایہام گوئی سے سادہ نگاری کی طرف ان کے شعری سفر کی روداد بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ حاتم کی نظم گوئی پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ "قصۂ قہوہ"، "عرض" اور "حالِ دل" کے علاوہ "دیوان زادہ" میں بہت سی قطعہ بند غزلیں بھی موجود ہیں" مثلاً "نکتہ چینوں سے"، "روزِ میثاق"، "قاصد"، "خوف و رجا"، "گورستان" اور "ماتم حسن و حسین" وغیرہ حاتم کی نظمیں "بارھویں صدی" اور "نیرنگیِ زمانہ" کی حیثیت شہر آشوب کی سی ہے لیکن ڈاکٹر زور نے اس کی نشان دہی نہیں کی ہے اور انھیں دوسری نظموں سے ممیز نہیں کیا ہے اور یہ لکھنے پر اکتفا کی ہے:

> چوتھی نظم "نیرنگیِ زمانہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہے یہ گویا عہد محمد شاہ کا ایک منظوم خاکہ اور اردو کی ان ابتدائی نظموں میں سے ہے جن میں شاعر نے اپنے زمانے کی معاشرت اور سماجی رجحانات کی عکاسی کی ہے۔ حاتم کے بعد ان کے شاگرد سودا نے اس قسم کی نظموں کی طرف توجہ کی تھی۔"

آخر میں حاتم کی فارسی شاعری پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے "دیوان زادہ" کے بارے میں ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں کہ حاتم کو ۱۱۶۸ھ سے قبل ہی اپنے منتخب کلام کو ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۱۶۸ھ میں انھوں نے اسے عملی جامہ پہنایا اور اس کا دیباچہ بھی قلم بند کیا لیکن مزید چالیس سال تک حاتم تقیدِ حیات رہے اس لیے اس میں اضافے ہوتے رہے۔ حاتم ایک پُرگو شاعر تھے اور انھوں نے طویل عمر پائی تھی۔ اس لیے دیوان زادہ کی ترتیب سے قبل ان کے بہت سے دیوان مرتب ہو کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ڈاکٹر زور اس خیال کے حامل ہیں کہ ابتدائی چالیس برس حاتم نے آبرو، ناجی، مضمون اور یکرنگ کے رنگ میں شاعری کی اور بعد کے چالیس سال زبان اور اسلوب شعر کی اصلاح

جیسی اہم لسانی خدمت میں مصروف رہ کر اسی تحریک کے تحت شعر کہے ہیں۔ مختصر یہ کہ "سرگذشتِ حاتم" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر زور کو تحقیق سے طبعی لگاؤ تھا اور تحقیق کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

"داستان ادب حیدر آباد" میں حیدر آباد کے تین سو سالہ اردو فارسی اور عربی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے ارباب کمال کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کے رشحاتِ قلم کی مجمل خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس تصنیف میں شہر حیدر آباد کی علمی و ادبی تحریکات اور ان کا پس منظر واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۱ء میں طارق برقی پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ گولڈن جوبلی ایڈیشن کی حیثیت سے ۱۹۸۳ء میں نظامس اُردو ٹرسٹ کی جانب سے طبع ہوئی۔ کتاب میں دس مختلف ابواب ہیں یہ ادوار ۱۰۰۰ھ سے شروع ہو کر ۱۳۷۰ھ پر ختم ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۵۰ھ پر محیط ہے اور دکنی کے اولین شعراء اور مصنفین کے واقعات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے۔ "عہد ابن خاتون و ابن نشاطی" ۱۰۵۰ھ ۔ ۱۱۰۰ھ ہے۔ اور دور انتشار ۱۱۰۰ھ سے شروع ہو کر ۱۱۵۰ھ پر ختم ہوتا ہے جس کے بعد "ادب و شعر کا احیا" سُرخی قائم کر کے ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ کے نثری اور شعری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عہد ارسطو جاہ ۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۰ھ ہے جو اس دور کی نامور ادبی شخصیتوں کا مختصر حال اور ان کی علمی و ادبی یادگاروں کو متعارف کرواتا ہے "چندا اور چند و لال" (۱۲۲۰ھ ۔ ۱۲۵۰ھ) حیدر آباد کے آصف جاہی شعراء کے تذکرے پر مشتمل ہے "شمس الامرا اور شمس الدین فیض" (۱۲۵۰ھ ۔ ۱۲۸۰ھ) میں شمس الامراء کی ادب نوازی کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کے شاعروں کی تخلیقات کی ادبی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ "مختار الملک اور وقار الملک" (۱۲۸۰ھ تا ۱۳۲۰ھ) اور "عہد کرشن پرشاد و یمین السلطنت" (۱۳۲۰ھ ۔ ۱۳۵۰ھ) میں اس دور کی ادبی شخصیتوں کے واقعات زندگی اور ادبی اکتسابات کا بیان

اس کتاب کی آخری سرخی "جامعہ عثمانیہ" (۱۳۵۰ھ تا ۱۳۷۰ھ) ہے جس میں اُردو ذریعۂ تعلیم کی اس دانشگاہ اور اس کے فارغ التحصیل ادب نوازوں کا حال قلمبند کیا گیا اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ "داستان ادب حیدر آباد" میں ڈاکٹر زورؔ نے ابتداء سے لے کر فرزندان جامعہ عثمانیہ کی ادبی مساعی تک کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کو عوام سے روشناس کروایا ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات محدود تھیں۔ حیدر آباد کے ایسے بہت سے شعراء اور ادیبوں کو اس کتاب میں متعارف کروایا گیا ہے جن کی ادبی مساعی کو مرورِ زمانہ کی گرد نے نئی نسل کی نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر زورؔ کی تحقیقی صلاحیتوں کا اچھا ثبوت فراہم کرتی ہے انھوں نے ہر دور کے شعراء اور ادیبوں کا حال بڑی تلاش اور جستجو کے بعد قلمبند کیا ہے قطب شاہی دور اور پھر آصف جاہی عہد کی اہل قلم شخصیتوں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ متعارف کروایا ہے اور ان کے متعلق ضروری معلومات مستند ماخذوں سے حاصل کر کے جمع کر دی ہیں۔

تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں طبع ہوئی اس میں اُردو اور فارسی کے نامور شعراء کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ایسی چودہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کے مصنف یا مؤلف ہندو تھے اس جلد میں ہندو کاتبوں کے تحریر کیے ہوئے تیئیس قلمی نسخوں یا ہندو اہلِ قلم کی فرمایش پر لکھی ہوئی دس کتابوں کی تفصیل موجود ہے سنسکرت اور قدیم ہندی کے چودہ ترجمے اور ہندو ارباب علم و دانش کی ملک پانچ کتابیں بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ جلد دوم میں ڈاکٹر زورؔ نے اڑتالیس عربی کی قلمی کتابوں دو سو پچاس فارسی نسخوں اور دو سو اکیاون اُردو اور پانچ ہندی مخطوطات کا جائزہ لیا ہے یعنی جلد دوم میں جن مخطوطات کی وضاحت کی گئی ہے ان کی تعداد پانچ سو ہے اس جلد کے آخر میں بھی اشاریہ موجود ہے اور مخطوطات کی فہرست بلحاظ موضوع تیار کی گئی ہے۔

"فرخندہ بنیاد حیدر آباد" ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں طارق برقی پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اول کا عنوان تاریخ ہے جس کے تحت شہر حیدر آباد کی تعمیر اور اس کی آبادکاری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس عہد کی قدیم عمارات مثلاً چار مینار، دولت خانہ عالی، چندن محل، سجن محل، اعلیٰ محل، حنا محل، داد محل، ندی محل، اور محل کوہ طور وغیرہ کے طرز تعمیر اور ان کی تاریخی و ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حیدر آباد کی نہروں، یہاں کے محلوں اور باغات وغیرہ کی زندہ اور دلکش تصویریں نظروں کے سامنے متحرک کر دی ہیں۔ اس حصے میں قطب شاہی عمارات کے علاوہ حیدر آباد میں دورِ مابعد کی تعمیر کردہ عمارات کے متعلق بھی مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان "داستان ادب حیدر آباد" ہے اور "روایات" کی سرخی کے تحت "حیدر آبادی لیل و نہار کی داستانیں" بیان کی گئی ہیں۔ اس حصہ دوم میں وہ بیس افسانے جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سے قبل "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" میں منظرِ عام پر آچکے تھے۔ "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" کی حیثیت دراصل قند مکرر کی سی ہے اس کتاب کے حصّے اول میں قطب شاہی دور کی جن مختلف عمارات کی مرقع کشی کی گئی ہے ان کی تفصیل اس سے قبل "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" میں بیان کی جا چکی تھی۔ "غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد" اس کتاب کا دیباچہ ہے جس میں ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں کہ شہر حیدر آباد نے اپنی زندگی کے تین سو ۳۰۰ بہتر سال ختم کر لیے ہیں اور اس عرصے میں وہ ایسے صاحب کمالوں، فنکاروں اور اہل ذوق کا گہوارہ رہا ہے جنھوں نے اس مرز بوم کو ایک خاص تمدن اور معاشرت کی علامت بنا دیا ہے۔ یہاں مذہب و عقاید کی کوئی قید نہیں اور سب مل جل شیر و شکر ہو کر ایک مخصوص ثقافت کو پروان چڑھانے کا باعث ہوئے ہیں" فرخندہ بنیاد حیدر آباد" حیدر آباد اور اس کے تاریخی و ثقافتی تناظر کو سمجھنے میں ہماری رہبری

کرتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ اس کتاب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدر آباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے معائب اور محاسن دونوں کا مکمل مرقع رہا ہے۔ علم و ہنر فضل و کمال اور فنون لطیفہ کی قدردانی و نشو و نما کے لیے گذشتہ ایک صدی میں راجاؤں اور نوابوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کو ہندوستان کبھی نہ بھلا سکے گا اگر ازمنہ وسطیٰ کی یادگار یہ شخصی حکومتیں نہ ہوتیں اور صاحبان کمال کی قدر افزائی نہ کرتی ہوتیں تو گذشتہ سو دو سو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنون لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے"

آخر میں ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں کہ "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" جیسی کتابوں کی وجہ سے حیدر آباد کے قدیم کلچر سے آنے والی نسلیں روشناس ہو سکیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی یہ بھی ایک اہم خدمت ہے کہ انھوں نے ماضی کے نقوش کو دستبرد زمانہ سے بچانے اور انھیں اپنی کتابوں میں محفوظ کر دینے کی کوشش کی ہے اس کی اہمیت تاریخی و ثقافتی بھی ہے اور ادبی بھی۔

"تذکرہ مخطوطات" کی تیسری جلد ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ جلد سوم میں اکثر ایسے شعراء اور ادیبوں کا ذکر آگیا ہے جن سے ادبی دنیا زیادہ متعارف نہیں تھی۔ اور انھیں خوش اسلوبی کے ساتھ روشناس کروانے کا سہرا ڈاکٹر زورؔ کے سر ہے بعض شعراء کے نام تذکروں میں ملتے ضرور تھے لیکن ان کے دواوین کسی کی نظر سے نہیں گذرے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ایسے بے مثل و نایاب جواہر پاروں کو جمع کر کے ایک گراں بہا ادبی خدمت انجام دی ہے اور تاریخ ادب اردو کو مالا مال کر دیا ہے کچھ مخطوطات ایسے بھی ہیں جن کی نقلیں یا نسخے ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں میں نہیں ملتے بعض مخطوطوں کے دوسرے نسخے صرف یورپ کے کتب خانوں میں مخزونہ ہیں۔ تیسری جلد کے بعض قلمی

نسخوں سے حیدر آباد کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کے چند اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اساتذۂ سخن کے قلم کی تحریریں محقق کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ان کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے تحقیق اور مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ نئی نئی معلومات سے وہ اپنا دامن بھرتے رہے اور اپنی گذشتہ غلطیوں کو تسلیم کرنے میں کوتاہی نہیں کی اس کے لیے تاویلیں نہیں تراشیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخطوطات کی جلد اول میں جن شعراء اور ادیبوں کا ذکر آیا تھا۔ ان کے متعلق مزید معلومات فراہم ہوئیں تو ڈاکٹر زورؔ نے تیسری جلد میں انھیں پیش کر دیا۔ تیسری جلد میں دو سو مخطوطات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے قدیم دکنی شہ پاروں کو صدیوں کی گرد و غبار سے نکال کر اُردو داں طبقے سے انھیں متعارف کروانے کے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کا ایک قابل ذکر کارنامہ مثنوی "طالب و موہنی" بھی ہے یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں نیشنل فائن آرٹ پرنٹنگ پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ یہ ادارہ ادبیات اُردو کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے سید محمد و آلہ، سید محمد باقر موسوی خراسانی کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے وطن قم کو خیر باد کہا اور لاہور سے ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔ اس وقت یہاں شاہ عالم (۱۱۱۹ھ-۱۲۲۴ھ) سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے و آلہ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں شاہی منصبداروں میں شامل کر لیا جب نظام الملک آصف جاہ سے ان کا ربط بڑھا اور انھیں و آلہ کی ذہانت اور علمیت کا اندازہ ہوا تو انھوں نے و آلہ کو اپنا رفیق بنا لیا اور اپنے ساتھ دکن لے آئے۔ اور اس طرح و آلہ ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۳ء میں وارد حیدر آباد فرخندہ بنیاد ہوئے جب نورالدین خان شہامت جنگ کو آصف جاہ نے حیدر آباد کا ناظم مقرر کیا تو و آلہ کو ان کا رفیق متعین کر دیا اور جنم گاؤں کے موضع گھن پور میں انھیں جاگیر بھی عطا کی۔ و آلہ رقمۃ الحروف کے جدِ اعلیٰ تھے۔ یہ جاگیر

حیدر آباد کے انڈین یونین میں ضم ہو جانے تک ہماری خاندان میں رہی ۔ والہ نے سید منصور کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ارکاٹ میں بھی والہ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ۔ اور جب محمد علی خان والاجاہ کو ان کے والد نے ترچناپلی کی حکومت تفویض کی تو والہ ان کے نائب مقرر کر دیے گئے، اور انھوں نے ترچناپلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور اٹھائیس سال قیام کے بعد ۱۱۹۲ھ مطابق (۱۷۷ء) میں یہیں وفات پائی۔ والہ کے حالات زندگی پر شمس اللہ قادری نے بھی ایک کتابچہ تصنیف کیا ہے ۔ محمد تقی ہمدم نے "لمعات شمس" میں والہ کے خاندانی حالات تفصیل سے قلمبند کیے ہیں ۔ والہ بقول ڈاکٹر زور ایک مرنجاں مرنج ادیب و شاعر تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول و ممتاز تھے ۔ ان کے کئی شاگرد مدراس میں دور دور تک پھیل گئے تھے والہ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں :-

"بہت بڑے مصنف اور شاعر اور انشا پرداز تھے۔ مختلف علوم میں مہارت
رکھتے تھے اور اچھے خطاط بھی تھے"

ڈاکٹر زور نے بڑی تحقیق اور محنت سے والہ کے خاندانی حالات اور ان کی تصانیف کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ والہ کی "دستور نظم" (۱۱۴۰ھ) علم عروض پر قلمبند کی گئی ہے اور "اساس الایمان" (۱۱۴۵ھ) میں بارہ اماموں کے حالات درج کیے گئے ہیں ۔ اور یہ طویل نظم ۲۴ ہزار اشعار پر محیط ہے اس کے علاوہ "قانون چرا انشا" "کشف الرموز در مکتوم" "عین تماشا یعنی مرغ نامہ" "کبوتر نامہ" "نجم الہدیٰ" اور "رازق باری" (مطبوعہ ۱۲۹۰ھ) ان کی بلند پایہ تصانیف ہیں ۔ والہ کے فارسی دیوان "گلستان خیال" کا بھی ڈاکٹر زور نے ذکر کیا ہے ۔ مبکش تھانوی نے والہ کی متعدد غزلیں منتخب کر کے کتاب "توحید الوجود" میں شائع کر دی ہیں ۔

طالب و موہنی کا قصہ سید محمد والہ نے مہاراشٹر کے تاریخی شہر پرینڈہ میں سنا تھا

اور اس داستان عشق سے متاثر ہو کر انھوں نے اسے دکنی میں نظم کیا تھا۔ مثنوی "طالب و موہنی" ۱۱۵۵ھ سے قبل مرتب کی گئی تھی اس کے صرف دو مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں ایک انڈیا آفس میں ہے اور دوسرا ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے کا مخزونہ ہے نصیر الدین ہاشمی نے "مدراس میں اردو" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میر تقی میر نے والہ کی اس مثنوی سے متاثر ہو کر مثنوی "دریائے عشق" لکھی تھی۔ ڈاکٹر زور تحریر کرتے ہیں کہ میری نظر سے عبدالولی عزلت کی دکنی بیاض گذری تھی جس سے استفادہ کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرے "نکات الشعراء" میں کیا ہے ممکن ہے کہ مثنوی "طالب و موہنی" عزلت کی ان کتابوں میں شامل ہو جنھیں وہ دکن سے اپنے ساتھ شمالی ہند لے گئے تھے ڈاکٹر زور نے مولوی عبدالحق کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ والہ قطب شاہی شاعر تھے اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ والہ نے اپنی مثنوی میں ابن نشاطی کا ذکر کیا ہے لیکن ڈاکٹر زور کا خیال یہ ہے کہ والہ کو ابن نشاطی کی مثنوی پسند نہیں آئی تھی اور والہ نے اس کے جواب میں "طالب و موہنی" کا قصہ نظم کیا تھا جو ان کی نظر میں "رنگین تر" تھا مثنوی "طالب و موہنی" (۱۰۵۷) اشعار پر مشتمل ہے اور زیادہ طویل نہیں ۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ابن نشاطی کی "پھول بن" کے اعلیٰ معیار کو یہ مثنوی نہیں پہنچ سکتی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والہ ایرانی نو وارد تھے ۔ ہندی اور دکنی الفاظ اور محاورے پر انھیں وہ قدرت حاصل نہیں تھی جو ابن نشاطی کو تھی ۔ فطری طور پر والہ کی زبان پر فارسیت کا غلبہ ہے جس سے ایک طرح کے تکلف کا احساس ہوتا ہے ڈاکٹر زور نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ لسانی اعتبار سے طالب و موہنی ٹھیٹ دکنی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ "اردو فارسی اور دکنی" کو ملا کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے چنانچہ خود شاعر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بچن کا اک نیا شیوہ دکھایا
ہندی اور فارسی دکھنی ملایا

یہ مالا گردن دانش کا ہے ہار مجھے ہے جیت اس فن میں نہیں ہار

شمالی ہند کے قیام کے دوران واؔلہ نے اردو سیکھ لی تھی اور دکن آکر دکھنی سے بھی واقفیت حاصل کی تھی۔ لیکن دکھنی محاورہ ان کے فارسی لب و لہجے پر پوری طرح غالب نہ آسکا تھا۔ قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ نے لکھا ہے کہ والہ نے "مقام دارور" کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ سید محمد واؔلہ نے "پرینڈہ" کا مثنوی میں بار بار نام لیا ہے جو مرہٹواڑہ کا ایک مشہور قلعہ اور قدیم آبادی کا مرکز ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے شاعری کی منظر نگاری اور استادانہ کمال کو سراہا ہے اور لکھتے ہیں کہ شاعر نے اخلاق و موعظت کا بھی اچھا درس دیا ہے۔

مثنوی "طالب و موہنی" کا دوسرا نسخہ جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں ہے ڈاکٹر زورؔ کی دسترس سے باہر تھا انھوں نے ایک ہی مخطوطے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایڈیٹنگ اور ترتیب متن کا کام انجام دیا ہے اگر وہ انڈیا آفس کے کتب خانے کے مخطوطے سے بھی ترتیب متن میں استفادہ کرتے تو بہتر تھا۔ انڈیا آفس کے نسخے سے ممکن ہے بعض ایسے اشعار کا اضافہ ہوتا جن میں داخلی شہادتیں موجود ہوں یا جن میں قصے کی نئی جزئیات شامل ہوں۔ دو مخطوطات کی موجودگی میں صرف ایک نسخے پر اکتفا کرنا ترتیب متن اور اصول تحقیق کی رو سے نامکمل اور تشنہ تدوین ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے کتاب کے آخر میں فرہنگ کی ضرورت غالباً اس لیے نہیں سمجھی کہ اس مثنوی کی زبان عام فہم ہے اور اس میں قدیم دکھنی الفاظ بہت کم نظر سے گذرتے ہیں۔

"معانی سخن" ۱۹۵۸ء میں نیشنل پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی جس میں محمد قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ "دیباچہ عمومی" میں دکنی شاعری کی تاریخ مختصراً بیان کی گئی ہے۔ اور مقدمہ میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے "معانی سخن" کلام محمد قلی قطب شاہ کا ایک اچھا انتخاب ہے اور اس کی شاعری کی بھرپور

نمائندگی کرتا ہے ڈاکٹر زورؔ نے یہ نکتہ پیش نظر رکھا ہے کہ ایسی نظموں کا انتخاب کیا جائے جن سے شاعر کے طرز ادا اور اس کے مخصوص تصورات کی بخوبی ترجمانی ہو سکے۔ اور اس مقصد میں ڈاکٹر زور اس لیے بھی کامیاب رہے کہ انھوں نے "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" کے مقدمے میں شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی قلی قطب شاہ اور اس کی شاعری کا چونکہ انھوں نے خصوصی مطالعہ کیا تھا اس لیے اس کے تمام پہلو ان کی نظر میں تھے "معانی سخن" میں محمد قلی قطب شاہ کی ایسی منتخب نظموں کو جگہ دی گئی ہے جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اور اس طرح اس انتخاب میں محمد قلی قطب شاہ کے تمام پسندیدہ موضوعات پر کہی ہوئی نظمیں موجود ہیں نظموں کے علاوہ شاعر کی غزلوں رباعیات، قصائد اور مراثی کا بھی اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل یہ انتخاب کلام ہر اعتبار سے نمائندہ انتخاب کلام کہلا سکتا ہے۔

"تذکرہ مخطوطات" کی چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں چھپی۔ اس میں صرف دو سو قلمی کتابوں پر وضاحتی نوٹ لکھا گیا ہے۔ لیکن چاروں جلدوں کی اجمالی فہرست بھی دی گئی ہے اور مصنفین کے نام اور اشاریہ بھی اس میں موجود ہے اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۵۹ء میں پانچویں جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس میں دو سو پچاس مخطوطات سے بحث کی گئی ہے اور دوسری جلدوں کی طرح اشاریہ وغیرہ بھی شامل کیے گئے ہیں پانچویں جلد نشان سلسلہ (۹۰۱) سے (۱۱۵۰) تک یعنی ڈھائی سو مخطوطات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے صرف مخطوطے کی وضاحت پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ شاعر و مصنف کے نام، وطن، ہمعصر شعراء اور دوسری معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں اگر ایک نام یا تخلص کی دو یا زائد ادبی شخصیتیں ہوں تو ان کی مفصل صراحت کر دی گئی ہے تاکہ تحقیق کرنے والے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ان وضاحتی فہرستوں سے ڈاکٹر زورؔ کے وسیع اور متنوع مطالعے اور ان کی تحقیقی ذکاوت کا اندازہ ہوتا ہے دکنی ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

تنقید

"ڈاکٹر زور ذہنی طور پر سائنٹیفک دبستان کے اصولوں سے قریب نظر آتے ہیں۔ "روحِ تنقید" ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف کے تنقیدی مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ مضامین ڈاکٹر زور کی عملی تنقید کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح "روحِ تنقید" کے مطالعے سے ڈاکٹر زور کے ادبی تصورات اور ان کی عملی تنقید دونوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ زیرِ بحث کتاب کا بغور مطالعہ کر کے اس کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے تنقید کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں ایڈیسن (Addison) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "صحیح نقاد وہی ہے جو خوبیوں پر نظر رکھتا ہے اور معائب کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے" ایڈیسن کا یہ قول قابلِ قبول اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس میں نقاد، قاری اور مصنف کے درمیان گویا مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تنقید تصویر کے دونوں رخ دکھانے اور تجزیے کے ذریعے سے صحیح نتائج تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اس لیے شاعر یا مصنف کے فن میں جو سقم اور جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ان کی پردہ پوشی نہ صرف مصنف کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے اور نہ قاری کے لیے۔ ڈاکٹر زور محاسن اور معائب دونوں کو نمایاں کرتے ہیں لیکن سخت تنقید اور دلخراش اعتراضات سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی "روحِ تنقید" اردو کی ان اولین تنقیدی کتابوں میں سے ہے جن کی بدولت اردو دان طبقہ مغربی اصولِ تنقید سے آشنا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر زور

کی اس کتاب کی اولیت یہ بھی ہے کہ ان سے پہلے بہت کم نقادوں نے اصولِ تنقید کی تدوین کی طرف توجہ کی تھی۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے ایک ہمعصر ادیب و نقاد حامد اللہ افسر نے اپنی کتاب "نقد الادب" میں لکھا تھا:

"ہماری زبان میں اصولِ تنقید پر کوئی کتاب نہ تھی اس خدمت کو جناب ابوالخیرات سید غلام محی الدین قادری زور نے انجام دیا۔ آپ کی کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی جس میں یورپ کے علمائے تنقید کے افکار و خیالات درج کیے گئے ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور اپنے قیام یورپ کے زمانے میں مغربی مصنفین کے ادبی تصورات و نظریات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے "روحِ تنقید" میں انھوں نے مغربی مصنفین کے تصورات کی خوشہ چینی کی ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں نو ابواب ہیں جن میں انھوں نے تنقید کی تعریف، ادب میں اس کی اہمیت و ضرورت اور دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے میں بقول مصنف "مبادی تنقید" کی تشریح کی گئی ہے تنقیدی اصولوں کی توضیح کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے اکثر جگہ مغربی مصنفین کے حوالے دیے ہیں۔ تنقید کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ تنقید محض نکتہ چینی یا عیب جوئی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انصاف پسندی کے ساتھ فیصلے صادر کرتی ہے اور خوب و زشت کے معیار مقرر کرتی ہے۔ ان کی دانست میں اچھی تنقید میں صرف تعریفی پہلو ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ تخلیقی بھی ہوتی ہے۔ یہاں ڈاکٹر زور نے اناطول فرانس، سوئیرن، متھو آرنلڈ، سینٹ بیو اور والٹر ریلے کے اقوال نقل کرتے ہوئے اپنے بیان کو تقویت پہنچائی ہے۔ ڈاکٹر زور نے تنقید کی چار قسمیں گنائی ہیں۔ پہلی تنقید وہ ہوتی ہے جس میں کسی فن تخلیق پر "حکم لگایا جاتا ہے" دوسری قسم تنقید کی ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن میں ماحول، مادی حالات اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فن پارے کے محاسن اُجاگر کیے جائیں۔ تیسری قسم داخلی اور چوتھی قسم خارجی نوعیت کی حامل ہوتی

ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تنقید کوئی غیر اہم اور غیر موثر صنفِ ادب نہیں بلکہ اپنے طور پر وہ ایک علٰحدہ تخلیق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے خیال میں تنقید چند اصولوں کی تابع ہوتی ہے وہ اس کی جانچ پڑتال کرتی ہے کہ:

(۱) تصنیف جس صنفِ ادب سے تعلق رکھتی ہے اس کے اہم خدوخال اور خصوصیات اس میں موجود ہیں یا نہیں۔

(۲) معانی و مطالب کے اعتبار سے زیرِ بحث تصنیف اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر رہی ہے یا نہیں۔

(۳) زیرِ تنقید تصنیف کی زبان و اسلوب کی قدر و قیمت کا تعین

(۴) شاعر یا مصنف کی شخصیت، اس کے ماحول اور دیگر تصانیف کا مطالعہ

(۵) فن پارے کی ادبی تکمیل پر تبصرہ

ڈاکٹر زورؔ نے تنقید کے جن اصولوں کا اوپر ذکر کیا ہے وہ غالباً انھوں نے ہڈسن کی کتاب انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر" Introduction to the Study of Literature اور میتھو آرنلڈ کی تصنیف "ایسے ان کرٹی سزم" Essays in Criticism سے اخذ کیے ہیں ڈاکٹر زورؔ نے مغربی مصنفین کے حوالوں سے اپنے بیانات کو تقویت پہنچائی ہے وہ ریاضی اور فلسفے کے برخلاف ادب کو فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ تصور کرتے ہیں اور اس خیال کے حامل ہیں کہ اچھی نظم جو قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کی ترجمان ہو فنون کا ایک جزو ہوتی ہے ڈاکٹر زورؔ نے عربی ادبیات کی اہم شخصیتوں ثعالبی، تھانوی اور شیخ لویس کے اقوال سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انگریزی سے میتھو آرنلڈ، بروک، نیومن مورلے لینڈر، سوئبرن اور ہڈسن کے ادبی تصورات کو انھوں نے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے تنقیدی تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے خیالات کم اور مغربی مصنفین کے اقوال زیادہ پیش کیے ہیں جس پر بعض

وقت یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کی تنقیدوں میں استفادی عنصر زیادہ ہے اور اپج کی کمی پائی جاتی ہے۔ ادب کی اہمیت اور تخلیق ادب جیسے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ نے ارسطو کے نظریہ نقالی کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ انھوں نے ادب دو حصّوں یعنی نثر و نظم میں تقسیم کرتے ہوئے اس کی مختلف اصناف کا سرسری جائزہ بھی لیا ہے نظم میں انھوں نے رزمیہ، عشقیہ اور ڈرامائی شاعری کا شمار کیا ہے لیکن ہیئت و مواد کے اعتبار سے شاعری کی دیگر اصناف کی طرف توجہ نہیں کی ہے اس کا سبب غالباً مغربی نقادوں کی پیروی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور مرثیہ کا بھی ذکر یہاں ضروری تھا اسی طرح ڈاکٹر زورؔ نے نثر میں تاریخی فلسفیانہ اور ادبی تحریریں شامل کی ہیں ان کی مزید وضاحت کی جاسکتی تھی اور "ادبی تحریروں" کی سرخی کے تحت افسانہ نگاری، ناول نویسی اور مضمون نگاری وغیرہ کو جگہ دی جاسکتی تھی لیکن ڈاکٹر زورؔ نے ایک چارٹ تیار کرکے ادب کی تقسیم تین اصناف میں حسب ذیل عنوانات کے تحت کی ہے۔ خارجی داخلی اور مشترک (خارجی و داخلی)۔ تنقید نگار کے فرائض کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ خاصے خیال انگیز ہیں اور اردو میں پہلی بار اتنی صراحت و وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے تنقید نگار کے لیے "سائنٹیفک تشریح و تجزیہ" متفرق اصناف ادب سے متعلق معلومات تاریخی ژرف نگاہی فنی لوازم سے واقفیت، خوش مذاقی اور غیر جانبداری کو ضروری قرار دیا ہے اور تنقید میں بیجا اعتراضات سے شاعر و مصنف کو پست ہمت کر دینے کے رجحان کی مخالفت کی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے لی ہنٹ، مل، مکالے، کارلائل امرسن اور ورسورتھ وغیرہ کے اقوال نقل کرکے اپنے بیان کی مزید وضاحت کی ہے۔ جب ہم ڈاکٹر زور کی نظری تنقید کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ قدیم مفکرین میں افلاطون اور ارسطو دونوں کے تصورات سے متاثر ہیں لیکن انھیں من و عن قبول نہیں کرتے انھوں نے افلاطون پر

یہ تنقید کی ہے کہ اس نے ادب کو اخلاق کا حلقہ بگوش بنا دینے کی کوشش کی ہے جو درست نہیں وہ رقمطراز ہیں:

"اظہار حقیقت کے دو ذریعے ہیں۔ ایک داخلی دوسرا خارجی۔ ادب کا بہترین اور اعلیٰ نمونہ وہی ہے جس میں کائنات پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ ادب کا حقیقی اور آخری مقصد بیشک صداقت اور اخلاقیات ہے لیکن عملی نہیں بلکہ علمی، ظاہری نہیں بلکہ معنوی، منطقی اور استدلالی نہیں بلکہ اصولی اور حقیقی"

ڈاکٹر زور نے رسکن کے اقوال کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ادیب و شاعر زندگی کی صداقتوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور فن میں ان کی پیشکش پر قادر ہیں اس لیے ادب کا مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حقائق کا انکشاف کرے اور قاری کی معلومات میں اضافہ کرنے اور اسے ایک حیرت انگیز تحیر سے ہمکنار کردے۔ ادب اور اخلاق سے بحث کرتے ہوئے یہاں ڈاکٹر زور نے افادی اور اخلاق پہلو کو بطور خاص پیش نظر رکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مقصدیت کے قایل ہیں اور اس کے سماجی کردار کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر زور کے ادبی تصورات انھیں سائنٹفک تنقید کے دبستان سے قریب کر دیتے ہیں اور وہ ہمیں ایک ہیومنزم (Humanism) کے پرستار کے روپ میں نظر آتے ہیں:

"روح تنقید" کے حصہ دوم "ارتقائے تنقید" میں تنقید کے آغاز و ارتقاء سے بحث کرتے ہوئے یونان سے افلاطون، ارسطو، تھیوفراسطس، ارسطاکزی نس ارسطارکس زاے لس، ڈایونی سی اس اور لانجے نس کے ادبی تصورات پر روشنی ڈالی ہے۔ روما کے نمایندہ نقادوں میں وہ سسیرو وے ادء ہوریث، ٹے سی ٹس، بلوطارق اور کوئن طلین کو منتخب کرکے یہ بتاتے ہیں کہ روما کے دانشوروں کے پاس ادب کا تصور کیا تھا' "ازمنہ وسطی"، "عصر اصلاح"، "عصر بیداری" اور انکشاف دنیائے جدید"، اسی سلسلے

کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ فرانس نے بھی ادبی تصورات کی نشوونما میں اہم حصہ لیا ہے وہلے، اسکالیجر، مالہرب، بوالو، پیرو، روسو، میدم دا اسٹیل سینٹ بیو، تین جے تیمیر وغیرہ کے ادبی تصورات کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں انگلستان کے ڈریڈن، ایڈیسن پوپ اور جانسن کے نظریات سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے جانسن کے ادبی تصورات کو بہت سراہا ہے اور اس کی "ناقدانہ شان" کے معترف و مداح ہیں۔ انھیں جانسن اور ایڈیسن کی عملی تنقید کا یہ پہلو بطور خاص پسندیدہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیر بحث کتاب کی خوبیوں اور اس کے محاسن کو بھی اجاگر کرکے شاعر و مصنف کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"ایڈیسن نے ایک کامگار نقاد کی خصوصیات میں لکھا تھا کہ بہترین نقاد وہی ہے جو کسی ادبی کارنامے کے محاسن کی نشاندہی کرے نا کہ معائب کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر نکالے۔ جانسن بھی اسکا ہم آہنگ تھا اس کی رائے تھی کہ خداداد ذہانت رکھنے والے اور عام آدمی کے لیے یہ بات کہ ایسے انشاپردازوں کا مطالعہ کرے جن میں محاسن کی کثرت ہو بہ نسبت نقائص ظاہر کرنے کے زیادہ نیچرل ہے اس لیے کہ تنقید کا مقصد یہ نہیں کہ طرفدار ترجمانی کے ذریعے کسی کی تعریف کریں اور نہ کسی کی تذلیل، بلکہ شعور کو رہنما بنانا اور وہ جو کچھ رائے دے اسی کو ظاہر کردینا نیز صداقت پر عمل پیرا رہنا اور وہ جو کچھ دکھلائے اسی کو بیان کردینا ادبی تنقید کا بہترین فرض ہے"۔

مندرجہ بالا اقتباس ذرا طویل ہوگیا ہے لیکن اس سے ڈاکٹر زور کے ادبی تصورات کی پوری طرح وضاحت ہوجاتی ہے

ڈاکٹر زور کی عملی تنقید سے بھی ان کے ادبی عقاید کی وضاحت ہوتی ہے "روح تنقید" میں اگر انھوں نے تنقیدی تصورات سے بحث کرکے اپنے ادبی نظریات کی تشریح کی ہے تو "روح تنقید" حصہ دوم میں اپنی عملی تنقید کے نمونے پیش کردیے ہیں۔ اس کتاب کے

بعض مضامین موقر جرائد میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے تھے اس میں سے تین ایسے مضامین بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو "تین شاعر" کے عنوان سے اس سے قبل کتابی صورت میں شائع ہو چکے تھے۔ "میر انیس کی شاعری" "ہو ریس اسمتھ کی شاعری"، اور "میر تقی میر کی مثنویاں" کو بقول مصنف "تمام تنقیدوں کو ایک جگہ محفوظ کرنے کے خیال سے" اس مجموعے میں جگہ دی گئی ہے۔ "روح تنقید" حصہ دوم" کا پہلا مضمون "ادبیات اُردو اور تنقید نگاری" اس اعتبار سے اہم معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ڈاکٹر زور کی نظری تنقید کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ "فن نقد شعر" "تنقید کی ضرورت" "اُردو رسائل کے تنقیدی عنصر" اور اس کے اقسام میں تنقید کی قسموں سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے تنقید کی تین قسمیں قرار دی ہیں (۱) تخریبی (۲) تعمیری اور (۳) تخلیقی۔ مضمون کے آخر میں عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کر دیے گئے ہیں اور ڈاکٹر زور یہ بتاتے ہیں کہ مختلف اصناف ادب پر عملی تنقید کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "بزمیہ مثنوی"، غالب کی شاعری، افسانہ نویسی، اردو سوانح میں حیات جاوید کا مقام جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون نویسی کے ذیل میں خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری کی نگارشات پر کس طرح تنقید کی جانی چاہیے اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں "روح تنقید" لکھی گئی ہے اردو میں تنقید نگاری کا فن اپنے عہد طفولیت میں تھا اور ہماری زبان میں اس قسم کی تصانیف کی ضرورت تھی جن میں تنقید سے متعلقہ مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہو اور اس سلسلے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں "روح تنقید" کی ادبی حلقوں میں بڑی اچھی پذیرائی ہوئی اور اس تصنیف نے ڈاکٹر زور کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ "ٹامس گرے" اور اس کی شعری تخلیق" میں ڈاکٹر زور کی مغربی ادب سے اثر پذیری کا عکس نمایاں ہے۔ انھوں نے تھامس گرے کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس دور کے سماجی اور ادبی ماحول پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے

بعض انگریز مصنفین کے حوالے بھی دیے ہیں اور گرے کی تمام ادبی تخلیقات اور بطور خاص اس کی مشہور المجی کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ "طبقات ناصری اور اس کا مصنف" میں منہاج الدین ابو عمر عثمانی کی وسیع معلومات اور علمیت کو ڈاکٹر زور نے بہت سراہا ہے اور لکھتے ہیں کہ میجر راوٹی کوشش کے باوجود اس تصنیف میں کوئی بڑا اسقم نکالنے سے قاصر رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ابو عمر عثمان کے خاندانی پس منظر، ان کے واقعات زندگی تعلیم و تربیت اور دیگر تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اپنے گھریلو ماحول اور گرد و پیش کے حالات نے ان کی ذہنی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اس تنقیدی مضمون میں یہ تبلانے کی کوشش کی ہے کہ "طبقات ناصری" کا مصنف ایک ایسا محقق ہے جو پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور مستند حوالوں پر اپنے بیانات کی بنیاد رکھتا ہے اس لیے اس کے بیانات کی تردید مشکل ہے۔ "طبقات ناصری" کا مقابلہ و موازنہ ابوالقاسم فرشتہ کی مشہور تاریخ "گلزار ابراہیمی" موسوم بہ تاریخ فرشتہ" سے کیا ہے۔ یہاں ہم ڈاکٹر زور کی تقابلی تنقید سے روشناس ہوتے ہیں۔ میجر راوٹی نے "طبقات ناصری" کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ" بالعموم مترجم اصل مصنف کے بیانات کو مستند تصور کرتے ہوئے محض ترجمے کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن راوٹی نے ۴۶ کتب تواریخ کی مدد سے اس کی جانچ پڑتال کی ہے کہ "طبقات ناصری" میں جو تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے وہ کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ "روح تنقید" حصہ دوم کے اکثر مضامین میں اصولی بحثیں موجود ہیں۔ مثلاً "غالب کی ذہنیت" میں غالب کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کے علاوہ مشرقی اور مغربی شاعری اور ان پر تنقید کرنے کے اصول اور "اسلوب بیان" عنوان کے تحت تنقیدی اصولوں کی توضیح بھی کی گئی ہے اور پھر انھیں اصولوں کو غالب کی شاعری پر منطبق کرتے ہوئے ان سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے جہاں بیدل اور میر سے غالب کا موازنہ کیا ہے وہاں تقابلی تنقید کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے

"روحِ تنقید میں" فرانس اور ارتقائے تنقید کے زیرِ عنوان میڈیم ڈی اسٹیل اور ٹین کا ذکر کیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے خیالات سے خوشہ چینی بھی کی ہے۔ چنانچہ غالب کی ذہنی نشوونما کے زیرِ عنوان ڈاکٹر زور نے غالب کی زندگی اور ان کے خاندانی حالات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ گردوپیش کے سماجی ماحول اور خاندانی حالات کے آئینے میں شخصیت کا مطالعہ کرنے کی کوشش بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ "حالی اور اردو نثر" میں بھی "حالی کی ذہنی نشوونما" کے زیرِ عنوان اُس عہد کے ثقافتی، سیاسی اور سماجی رجحانات کی طرف اشارے کیے ہیں اور حالی کے طرزِ فکر کو انقلابِ زمانہ کا ثمر قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"حالی ابھی پچیس برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہ قیامت خیز واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کے باعث ہندوستان کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ اس واقعے کے اثر سے دراصل کئی حساس ہستیوں کو ایک ایسا تازیانہ لگا جس کے بعد ان کے قدم ڈگمگائے بغیر نہ رہ سکے۔ اگرچہ حالی کی سنجیدہ طبیعت پر ظاہری حیثیت سے اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا لیکن یہی وہ واقعہ ہے جس نے ان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس کے ذریعہ سے وہ غیر ارادی طور پر عظیم الشان منزل تک پہنچے۔"

میر حسن کی مثنویوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے بھی ڈاکٹر زور نے اصولی تنقید اور عملی تنقید کے ملے جلے نمونے پیش کیے ہیں۔ مثنوی کی چار قسموں رزمیہ، بزمیہ، حکمیہ اور صوفیانہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مشرقی ادبیات کے عہدِ اولین میں ڈرامے کا فقدان رہا ہے اور اس کمی کی رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں نے ایک حد تک تلافی کر دی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے اچھی مثنوی کی خصوصیات اور مثنوی کے فنی لوازم اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر زور عربی و فارسی زبان میں اس کے اہم نمونوں

کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رزمیہ عناصر کا اردو شاعری میں ابتدا ہی سے فقدان رہا ہے۔ مرثیہ نگاروں کا یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ انھوں نے معرکہ آرائی کے مناظر اور جنگ کی مرقع کشی کے خوبصورت نمونوں سے اردو شاعری کو مالا مال کر دیا ہے۔ آخر میں "سحر البیان" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے فنی محاسن پر ڈاکٹر زور نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور میر حسن کی جذبات نگاری کی انسانی نفسیات سے ان کی واقفیت اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔ ان کی دانست میں اس مثنوی کی اہمیت اس میں مضمر ہے کہ میر حسن نے اپنے عہد کی ثقافت اور تمدنی میلانات کی مؤثر ترجمانی کی ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات، لباس و زیورات اور اس عہد کی طرزِ فکر کی اچھی عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے میر حسن کی سراپا نگاری اور ان کی شاعری کی محاکاتی صلاحیت کو بھی سراہا ہے۔ مثنوی کے ڈرامائی عناصر اور مکالموں کی برجستگی کو بھی وہ مثنوی کی کامیابی کا ضامن قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر زور نے جن تنقیدی تصورات کا اظہار کیا ہے ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر تصنیف کو اپنے عہد کی پیداوار اور اپنے ثقافتی ماحول کی آفریدہ سمجھتے ہیں چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:-

جس طرح ہر مصنف اپنے مخصوص زمانے کی پیداوار ہوتا ہے ہر تصنیف بھی اپنے ماحول کی تمام خصوصیات کا نمونہ ہوتی ہے اور وہی تصنیف زیادہ مقبول ہوتی ہے جس میں ماحول کی ترجمانی وفاداری کے ساتھ کی گئی ہو"

ڈاکٹر زور کو مثنوی سحر البیان میں جو حُسن نظر آئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شاعر نے فطرت کی مصوری اور نیچر کی مرقع کشی کے ذریعے سے بھی اپنی قادر الکلامی اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کالی داس، تلسی داس، امراالقیس اور انیس کے فن کا ذکر کرتے ہوئے "سحر البیان" کی منظر نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ انھیں مثنوی کے تمام کردار اپنے عہد کے نمایندہ اشخاص نظر آتے ہیں۔ اور اس مثنوی میں آصف الدولہ

کے عہد کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بازاروں کی چہل پہل دکانوں کی رونق عیش و سرود کے جلسے اور محفلوں کی گہما گہمی ہمیں حال سے نکال کر ماضی کے ایک گذرے ہوئے عہد میں پہنچا دیتی ہے۔

"فارسی نثر کا آغاز اور بوعلی بلعمی" میں فارسی نثر کی نشو و نما کا جائزہ لیتے ہوئے ایرانی ادبیات میں ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ فارسی نثر جن تشکیلی منازل سے گذری ہے ان کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کی خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون سے ڈاکٹر زور کی وسیع معلومات اور دوسری زبانوں کے ادب سے ان کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

"روح تنقید" کے ایک اور مضمون میں کیفی حیدر آبادی کی نثری اور شعری خدمات کا جائزہ لے کر ان کا صحیح ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیفی کے عہد کے ادبی ماحول کا بھی تجزیہ کر کے اس دور کے ادبی رجحانات کی خصوصیات نمایاں کی ہیں اور اس پس منظر میں کیفی کی شاعری کے محاسن پر ایک جامع تبصرہ تحریر کیا ہے۔ اور ان کے نمونہ کلام سے اپنے بیانات کی تصدیق کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے "روح تنقید" اپنے زمانۂ طالب علمی میں تصنیف کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب ان کا ذہن مغربی ادب سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا۔ نوجوان ذہن جس محرک کی زد میں آجاتا ہے اس کے حلقۂ اثر سے بآسانی نہیں نکل سکتا اور فکر و عمل پر اس کی چھاپ خاصی گہری ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور مغربی تہذیب اور مغربی ادب کے رسیا تھے ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ یورپ اور لندن میں اپنی تعلیم کی تکمیل کریں اور یہاں کی ہوش ربا تہذیب و ثقافت، یہاں کے نامور علماء اور یہاں کی جگمگاتی ہوئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ پیرس اور لندن کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مغربی ادبیات کا غائر مطالعہ کیا تھا اور اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہ اثر پذیری ان کے ادبی تصورات میں اپنا پرتو دکھاتی

رہتی ہے۔ "روح تنقید" سے ڈاکٹر زور کی مغربی ادبیات سے اثر پذیری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طالب علم کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو اپنی عالمیت سے مرعوب کر دے۔ یہی ذہنیت بڑی حد تک "روح تنقید" میں کارفرما نظر آتی ہے۔ "روح تنقید" میں بات بات پر مغربی مصنفین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ان کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان کے اقوال سے اپنی تحریروں کو سجانے کی کوشش نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد نے کسی قدر مبالغے کے ساتھ اس کے بارے میں لکھا تھا:

"ان مقولوں میں بعض سیدھے سادے ہیں اور بعض مبہم یا عمیق ہیں اور اس وجہ سے مزید تشریح کے محتاج ہیں ..... اس کے علاوہ ہر مقولے میں زاویہ نظر علٰحدہ علٰحدہ ہے اس سے اور پراگندگی پیدا ہوتی ہے"۔

مولوی عبدالحق نے بھی "تبصرہ بر روح تنقید" میں ڈاکٹر زور کی اس کتاب پر کڑی تنقید کی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع پر "روح تنقید" ان اولین کتابوں میں سے ہے جنھوں نے بعد کی نسل کے نقادوں کو راستہ دکھایا اور مغربی تنقید کے اصولوں سے انھیں روشناس کرانے میں مدد دی "روح تنقید" میں گہرائی، اپج اور غور و فکر کی کمی ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ اصول تنقید پر اردو میں پہلی تصنیف ہے اور نقش اول ہونے کی وجہ سے بعض کوتاہیاں اس میں موجود ہیں۔ آج تنقید کے نئے اصولوں سے ہم متعارف ہو چکے ہیں اور جدید تنقید سے واقفیت نے ہمیں نئی بصیرت عطا کی ہے لیکن اس زمانے میں ڈاکٹر زور کا اس اچھوتے موضوع پر اظہار خیال کرنا ایک چونکا دینے والی بات تھی۔

ڈاکٹر زور اپنی اس اولین تصنیف کو بہت عزیز رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے لکھا تھا:

"روح تنقید" مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ میری پہلی علمی و ادبی کوشش ہے اور اگرچہ

اس کے بعد میری ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں لیکن کوئی کتاب اُردو دنیا میں اتنی مفید و مقبول ثابت نہیں ہوئی حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسری کتابیں میری محنت و کاوش اور افادیت کی وجہ سے مقبولیت میں اس سے بڑھ جائیں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ "روحِ تنقید" کی مانگ روز افزوں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان وقتی کتابوں میں نہیں ہے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اوراقِ پارینہ بن جاتی ہیں اس میں زندگی کی قوت موجود ہے اور یہ اُردو ادب میں زندہ رہے گی"

"روحِ غالب" ۱۹۳۱ء میں مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ ٹائٹل پر سنہ تصنیف ۱۹۳۹ء تحریر کیا گیا ہے پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب اس زمانے میں غالب پر اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف سمجھی جاتی تھی۔ پہلے باب میں غالب سے متعلق ادب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ حالی، آزاد، طباطبائی بجنوری، عبداللطیف، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مالک رام اور مہیش پرشاد نے غالبیات میں جو اضافے کیے ہیں ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ دوسرا باب حیات غالب سے متعلق ہے اس میں غالب کی مختصر سوانح بیان کی گئی ہے لیکن ڈاکٹر زور نے غالب کے بارے میں نئی معلومات فراہم نہیں کی ہیں انھوں نے اس عظیم شاعر کی زندگی سے متعلق مطبوعہ مواد کو سلیقے کے ساتھ نئے انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب غالب کے ادبی کارنامے ہے جس میں ان کی فارسی شاعری اور نثر اور اس کے علاوہ اردو نثر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا باب "غالب کے اعزہ و احباب" ہے اس میں ان کے تلامذہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں خطوط غالب کے دلچسپ ادبی مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے "غالب کے خطوط کی خصوصیات" کے زیرِ عنوان 'غالب کی مکتوب نویسی کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے بعد ان کے خطوط کے نمونے دیے گئے ہیں اور ارتیس[۳۸] خطوط کے اقتباسات جن کے مکتوب الیہ

مختلف شخصیتیں ہیں، ہدیۂ ناظرین کیے گئے ہیں۔ ان میں میاں داد خاں سیاح متوطن سورت، منشی حبیب اللہ ذکا (حیدر آباد) ہرگوپال تفتہ (آگرہ) میر مہدی مجروح (پانی پت) حاتم علی مہر، قربان علی بیگ سالک اور شمشاد علی بیگ رضوان، منشی شیونرائن نواب امین الدین احمد خان رئیس لوہارو، پیارے لال، نواب یوسف علی خان بہادر، نواب رام پور اور کلب علی خاں بہادر نواب رام پور بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کتاب مطالعۂ غالب کے سلسلے میں قاری کی اچھی رہبری کرتی ہے اور غالب کی شاعری ان کی نثر اور مکتوب نویسی کے متعلق نقادانہ محاکمات کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تصنیف اس اعتبار سے ایک جامع اور قابلِ قدر تصنیف معلوم ہوتی ہے کہ اس میں غالب کے فن کے علاوہ ان کے نقادوں اور شارحین وغیرہ کی مساعی پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

"تین شاعر" میں ڈاکٹر زور نے میر تقی میر، میر امن اور ہوریس اسمتھ کے کلام پر نقیدی نظر ڈالی ہے۔ میر تقی میر کی غزلگوئی پر اکثر نقادوں نے سیر حاصل تبصرے کیے ہیں لیکن ان کی مثنویوں پر کم لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں میر تقی میر کی مثنویوں کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے ان کے شاعرانہ مقام کا تعین کیا ہے۔ نو مختلف عنوانات قائم کر کے ڈاکٹر زور نے ان مثنویوں کی ادبی قدر و قیمت پر تبصرہ کیا ہے اور ہر سرخی کے تحت میر کی مثنوی نگاری کے ایک خاص پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ مثنویوں کے مقام تحریر ان کے قصص اور ادب میں ان کی حقیقی قدر و قیمت جیسے موضوعات پر ڈاکٹر زور نے بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ "میر کی مثنویاں اور نواب اودھ" "میر کی مثنویوں میں ان کے ماحول کے متعلق معلومات" "میر کی مثنویوں میں ان کی ذات کے متعلق معلومات" اور "میر کی مثنویاں اور فطرت کی ترجمانی" میں بڑے موثر انداز میں میر کے ماحول، ان کی شخصیت و سیرت اور ان کے سماجی ماحول کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ ان عنوانات ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور شاعر کے کلام اور اس کی

شخصیت کو اس کے سماجی اور ثقافتی پس منظر میں دیکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔
آٹھویں سرخی میں لفظ نیچر سے متعلق بحث کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ یورپی فنکاروں کے یہاں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر زور نے نیچر کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک کا تعلق مظاہرِ فطرت اور مناظرِ قدرت سے ہے تو دوسری وہ ہے جو انفرادی جذبات کی دنیا سے متعلق ہوتی ہے۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میر کی شاعرانہ قوتوں کی جولانگاہ دوسری قسم کی فطرت ہے۔ یوں تو میر نے اپنی مثنویوں میں نیچر کے پہلے مفہوم سے تعلق رکھنے والی شاعری بھی کی ہے ان کی مثنوں میں مرغوں کی لڑائی، کتوں کے ہنگامے اور پالتو بلی منّی اور اس کے دو بچوں موہنی اور سوہنی کے کھیل کود اور ناز و ادا کی اچھی مصوری کی گئی ہے لیکن اس سے انھیں طبعی لگاؤ نہیں تھا۔

اس کتاب کا دوسرا شاعر میر انیس ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس کو میر انیس کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا ہے کہ انھوں نے اعلیٰ سیرتوں کی مرقع کشی کر کے ایک ایسی قوم میں جو اخلاقی گراوٹ اور پستی کا شکار ہو گئی تھی" ایک تحیّر خیز انقلاب پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر زور نے میر انیس کے مراثی کی مقبولیت کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے کہے ہوئے شعر ہر ایک کو اپنے دل کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

"انطباقی کیفیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ آجکل جہاں کسی کی زبان سے حضرت عباس اور علی اکبر اور حضرت زینب یا حضرت صغرا کے متعلق کوئی شعر نکل پڑتا ہے تو سننے والے اس کو اپنے گھر کے بزرگوں سے متعلقہ واقعہ سمجھ کر اس سے متاثر اور متاثر ہوتے ہیں۔"

انیس نے اردو شاعری میں جو گرانقدر اضافے کیے ہیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ انیس کی اصلاحی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انھوں نے "ہمارے خیالات میں مذہبی تخم بوئے" اور "ہمارے خیال میں اسلامیت کو موجزن کر دیا۔

ہمارے احساسات کی تہذیب کی اور ہمیں درسِ حق دے کر چوکنا کر دیا ہے۔ میر انیس کی ادبی خدمات ان کے کلام کے اصلاحی پہلو، ان کی وسیع معلومات، منظر نگاری، شاعری کی صوری لطافت، جذبات نگاری ان کے "اسی نوے ہزار اشعار" عورتوں کی نفسیات کے مرقعے" اور ان کی "زبردست صنّاعی" کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر زور ادبیات عالم کے شہ پاروں مثلاً ایلیڈ، مہابھارت، رامائن، پیراڈائز لاسٹ، شکسپیر کے ڈراموں اور شاہنامہ سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

"لیکن ان سب شہ کاروں پر ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مراثی انیس کو فوقیت حاصل ہے۔"

ڈاکٹر زور مراثی انیس کی اہم شخصیتیں، مراثی میں ان کے رول اور ان کی اہمیت، مراثی انیس کے موضوعات اور ان کے مقامی رنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میر انیس اگر ہندوستان کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے اور یہ مغائرت انھیں ان ہمدردیوں اور اس پر خلوص محبت سے روکے رکھتی جو آج میر انیس کے پڑھنے کے بعد حضرت زہرا حضرت زینب حضرت بانو حضرت صغریٰ یا حضرت ام کلثوم وغیرہ کے متعلق دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔"

کتاب کا آخری اور تیسرا شاعر" ہو ریس اسمتھ (۱۷۷۹ء ۱۸۴۹ء) ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیام یورپ کے زمانے میں ڈاکٹر زور کو اس شاعر کی تخلیقات کا غائر مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملا تھا۔ وہ اس کی شخصیت اور فن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعری شاعر کی فطرت اور سیرت کا عکس ہوتی ہے اور ہم اس آئینے میں اس کی ذات کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کا یہ بیان ان کے ادبی تصورات کی

کی ترجمانی کرتا ہے وہ لکھتے ہیں :

"جب کسی کتاب کا آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ مصنف کی ذات غیر مضمر طور پر اس میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہے گویا تصنیف ایک آئینہ ہوتا ہے۔"

ہوریس کے خاندانی پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے اس کے مفصل حالات زندگی بیان کیے ہیں اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے ۔ ہوریس، جانسن، ڈرائڈر اسکاٹ اور فٹز جیرالڈ اور مور کا مقلد تھا۔ ہوریس کے مضامین اور اس کی نثری خدمات کے علاوہ اس کی شاعری سے بھی بحث کی گئی ہے ۔ ہوریس کی مشہور نظم "ایک ممی سے خطاب" ہے جس میں شاعر ممی کو مخاطب کرکے ۔ زمانۂ قدیم کے حالات دریافت کرتا ہے اور مصر کی گذشتہ شان وشوکت اور اس کے گلی کوچوں کے بارے میں استفسار کرتا ہے ۔ اس نظم میں جو مختلف تلمیحات بیان کی گئی ہیں ان کی تشریح ڈاکٹر زور نے بڑی دیدہ وری کے ساتھ کی ہے۔ مشہور شاعر ممنن، تھیبس (مصر کا قدیم پایۂ تخت) ابوالہول سفنکس اور کیف (مصر کے اہرام کا بانی) پامپی کا مینار، ہومر، الیسہ (شہزادی) اور رومیولس (شہر روما کا بانی) جیسی قدیم شخصیتوں اور یادگاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرکے ہوریس کی نظم کی تلمیحات کے پس منظر میں تشریح کی گئی ہے ۔ آخر میں ڈاکٹر زور نے جو خود ایک خوش گو شاعر تھے ہوریس کی نظم "ایک ممی سے خطاب" کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا ہے ۔ یہ نظم انتالیس اشعار پر مشتمل ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور ہوریس اسمتھ سے کس حد تک متاثر تھے ۔ اس نظم میں تیرہ بند ہیں اور ہر بند میں تین شعر موجود ہیں اور ہر شعر کا ردیف قافیہ دوسرے سے مختلف ہے اس میں انگریزی کے اسٹانزا (Stanza) کی پیروی نہیں کی گئی ہے جس میں پہلا اور تیسرا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے غالباً یہ انداز ڈاکٹر زور نے ترجمے کی دقت کو پیش نظر رکھ کر اختیار کیا تھا۔ ایک بند

ملاحظہ ہو ۔

خدارا بات کر مدت سے تو محوِ خموشی ہے
زباں تو ہے پر اس کے نغمے پر کیوں پردہ پوشی ہے
زمیں پر اے ممی پھر تو کھڑا ہے اپنے پاؤں پر
ترے آگے دوبارہ چاندنی کا ہے وہی منظر
مگر تو ہستی بے جسم ہے کوئی نہ سایہ ہے
وہی ہے گوشت اور ہڈی وہی اعضا میں ڈھانچہ ہے

ایک سو چھیانوے صفحات پر مشتمل یہ مختصر سی کتاب ڈاکٹر زور کی تنقیدی صلاحیتوں اور ان کے ادبی تصورات کی موثر ترجمان ہے ۔

"جواہر سخن" باون صفحات کا ایک مختصر کتابچہ ہے ۔ ہندوستانی اکیڈمی نے اپنے مجموعہ منتخبات کا نام "جواہر سخن" رکھا تھا ۔ اس کی پہلی جلد کے تعارف میں ڈاکٹر تارا چند نے اس موضوع کے بارے میں لکھا ہے :

"ضرورت یہ تھی کہ ایک ایسا جامع انتخاب مرتب ہو جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنفِ سخن پر حاوی ہو اس میں تاریخی اصول بھی مد نظر رہے تاکہ شعرا اور ان کے زمانے کا تعلق عیاں ہو جائے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ کے سامنے آجائیں ۔ اس انتخاب میں اس امر کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ نہ تو اتنا مختصر ہو کہ شاعری کی خصوصیات اور اس کے شاہکاروں کی پوری طرح نمائندگی نہ ہو سکے نہ اتنا بسیط ہو کہ اس میں کل رطب و یابس شامل ہو جائیں ۔ چنانچہ یہ انتخاب انھیں اصولوں کے تحت تیار ہوا ہے"

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اردو ادب میں شاعری کے ایسے انتخابات کی بہت ضرورت ہے جن میں ہر عہد کے بہترین اور نمائندہ شاعروں کی تمام اصناف کے خاص نمونے مندرج ہوں ۔ ڈاکٹر زور نے "جواہر سخن" پر تنقیدی نظر

ڈالی ہے اور اس کی فروگذاشتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرتب "جواہر سخن" نے "قصہ ملکہ مصر" اور "قصہ لال و گوہر" کو ایک ہی شاعر کی تخلیقات قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اس تخلص کے دو شاعر دکن میں گذرے ہیں۔ پہلا زوال سلطنت دکن کے وقت موجود تھا اور اس کا نام سید محمد علی تھا اس نے "قصہ فیروز شاہ و ملکہ مصر" کا ۱۰۹۹ھ میں ترجمہ کیا تھا اور دوسرا شاعر اس سے ایک سو سال بعد گذرا ہے اس کا نام عارف الدین خان اور تخلص عاجز تھا اس کا دیوان بہت مقبول ہوا۔ ڈاکٹر زور نے "جواہر سخن" پر ایک اور اعتراض کیا ہے کہ اس میں نصرتی کے قصائد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے حالانکہ اس کے قصائد اعلیٰ درجے کے ہیں۔

ڈاکٹر زور ایک کثیر التصانیف ادیب تھے۔ وہ تمام زندگی تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ان کی مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے بیسیوں مضامین ملک کے موقر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر زور کے ایک شاگرد قدرت اللہ بیگ نے ان کے بیالیس تبصروں، پیش لفظ اور مقدمات کو مرتب کر کے "ادبی تاثرات" کے نام سے شائع کیا تھا۔

"ادبی تاثرات" کا پہلا تبصرہ علی حسین یطفی کی کتاب "مصنوعی بیوی" پر قلمبند کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں انھوں نے غیر ضروری نکتہ چینی سے کام نہیں لیا ہے اور نہ بے جا تعریف و تحسین سے سروکار رکھا ہے "ادبی تاثرات" میں "دنیائے افسانہ" کلام احسان "متاع اقبال" اور "باغ و بہار" پر جو تبصرے کیے گئے ہیں ان سے ڈاکٹر زور کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ پریم چند کی "پریم سوگ" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بے لاگ رائے بڑی دیانت داری کے ساتھ ظاہر کر دی ہے عظمت اللہ خان کے "سریلے بول" میں ان کی شخصیت کا ہلکا سا خاکہ بھی پیش کیا ہے "مقدمہ حکایات رومی" مترجم

مرزا عظمت اللہ بیگ میں ڈاکٹر زور نے کہیں کہیں انشا پردازی سے بھی کام لیا ہے اور کتاب اور مصنف کی ادبی کاوش پر تبصرہ کرنے کے بجائے وہ عبارت آرائی سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

"مولانائے روم کی مثنوی گنج شائیگاں ہے جس کو کبھی زوال نہیں یہ وہ صنم خانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا حالانکہ اس میں صدیوں سے حریفوں کی بادہ خواری جاری ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک عجائب خانہ کی طرح یہ مثنوی ایسے ایسے عجائب و غرائب سے مالا مال ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس سے مستفید ہوتا ہے۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا اب یہ اپنی ہمت ہے مرغ کو دانہ ڈالو اور ہنس کو موتی"

بحیثیت مجموعی "ادبی تاثرات" کے تبصرے اور مقدمات دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں اور ڈاکٹر زور کے وسیع مطالعے، ان کے شائستہ ذوق اور ادبی بصیرت کے غماز ہیں۔ تنقیدی نگارشات میں ڈاکٹر زور کا اسلوب بیان بہت شگفتہ اور موثر دلکش محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کے مضامین سے ان کے گہرے مطالعے، موضوع سے واقفیت اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ زیر بحث کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۹۶۳ء میں ادارۂ ادبیات اردو سے ڈاکٹر زور کی کتاب "ادبی تحریریں" شائع ہوئی جس میں مختلف موضوعات پر ان کے تیرہ مضامین شامل ہیں۔ "ادبی تحریریں" کے مضامین ڈاکٹر زور کی تنقیدی صلاحیتوں کے اچھے ترجمان ہیں۔ اس مجموعے کے قابل ذکر مضامین "دکنی ادب" "ہندوستان محمد قلی کی نظر میں" اور "قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام" ہیں۔ "دکنی ادب" میں ڈاکٹر زور نے تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں اس خاص خطہ ملک کے ادبی رجحانات اور یہاں کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ "ہندوستان محمد قلی کی نظر میں" ڈاکٹر زور نے محمد قلی کی ہندوستانی تہذیب سے جذباتی وابستگی

اور اس کے کلام میں مقامی رنگ اور ہندوستانی عناصر جیسے موضوعات پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محمد قلی ہندوستانی تہذیب کا سچا پرستار اور قدر دان تھا اور اسی سے اس کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ "قدیم ادب پر تحقیقی کام" کے زیر عنوان ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کے گرانقدر کارناموں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ "ادبی تحریریں" ڈاکٹر زور کے تنقیدی مضامین کا آخری مجموعہ ہے۔ اسے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ایک سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تنقیدی مضامین کے علاوہ ایک مضمون لسانیات پر بھی سپرد قلم کیا گیا ہے۔ مقدمے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر زور کی ہمہ جہتی صلاحیتوں اور ان کے سادہ و شگفتہ طرز تحریر پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں "زور نما" بھی موجود ہے جو ڈاکٹر زور اور ان کے مضامین کا ایک جامع اشاریہ ہے۔

صوتیات اور لسانیات

سرزمین دکن کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اسی خاک سے اٹھا تھا وہیں اسے یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ اردو کا پہلا ماہر لسانیات بھی دکن کا مایۂ ناز سپوت تھا۔ ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر زور ایک معروف ادیب ہیں۔ ایم اے کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے لندن یونیورسٹی کے "اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز" میں پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کے لیے داخلہ لینا چاہا تو ان کے پیش نظر "ہند آریائی کی تقابلی تنقید" کا موضوع تھا لیکن انھیں اس کا موقع نہیں مل سکا۔ انھوں نے اردو کے عہد قدیم کے ادب پر اپنا تحقیقی کام شروع کر دیا۔ یہ زور صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں لندن یونیورسٹی میں گراہم بیلی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ گراہم بیلی کو ہندوستان کی تاریخ و ثقافت اور ادبیات سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ اس سرزمین پر ایک عرصے تک قیام پذیر رہے تھے۔ بیلی اردو زبان کے شیدائیوں میں سے تھے اور ایک دور دراز اجنبی ملک کا باشندہ ہونے کے باوجود وہ بڑی روانی کے ساتھ صحیح اردو بول سکتے تھے۔ انھوں نے ہند آریائی زبانوں کا بھی بغائر مطالعہ کیا تھا اور تقابلی مطالعے سے انھوں نے مخصوص نتائج اخذ کیے تھے۔ اسی دلچسپی اور شغف کا نتیجہ تھا کہ انگریزی میں انھوں نے "مختصر تاریخ ادب اردو" اور "پنجابی زبان کی ایک قواعد" جیسی وقیع تصانیف مرتب کی تھیں۔ ڈاکٹر بیلی کے انہماک اور لسانیات سے

ان کی دلچسپی کی وجہ سے ڈاکٹر زور کی آتش شوق اور بھڑک اٹھی۔ لندن یونیورسٹی میں وہ پروفیسر ٹرنر کے لکچر بڑے غور سے سنا کرتے اور ان کے منعقد کیے ہوئے سیمینار میں ضرور شرکت کرتے تھے اور اسی طرح ماہر صوتیات پروفیسر ڈانیل جونس کی تقاریر کے موقع پر بھی وہ حاضر رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹرنر ہند آریائی لسانیات اور سنسکرت زبان کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے اور اس کا "فرمایا ہوا" اس سلسلے میں "مستند" سمجھا جاتا تھا۔ ٹرنر کی نیپالی ڈکشنری خاصی مقبول ہو چکی تھی اور ان کا ایک اہم علمی کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ لسانیات کے ان دیدہ وروں سے استفادے نے ڈاکٹر زور میں علم لسانیات کے مطالعے کا گہرا شوق پیدا کر دیا۔ لسانی مطالعے کا درک اور شغف ان ہی اساتذہ کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر زور نے لندن یونیورسٹی کے "اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز" میں آریائی زبانوں کی لسانیات کی تعلیم کے لیے پروفیسر آرلین ٹرنر کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا تو صوتیات کی تعلیم پروفیسر اے لائیڈ جیمس سے عام صوتیات اور انگریزی صوتیات ڈینیل جونس، مس لی لیاس اور آئی آرم اسٹرانگ جیسے لائق اور بین الاقوامی شہرت کے مالک اساتذہ سے حاصل تھی۔ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات پر "لے انسٹی ٹیوٹ دی فونیٹک" میں تحقیقاتی کام کا آغاز کر دیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر زور نے پہلوی اور جیسی زبانوں کا درس "سار بون یونیورسٹی" پیرس کے ادارہ صوتیات میں لیا اور گجراتی زبان پر ایک مقالہ جے بلوک کی نگرانی میں مکمل کیا۔ لندن یونیورسٹی سے اپنا تحقیقی کام مکمل کر کے جب ڈاکٹر زور حیدرآباد واپس ہوئے تو انھیں اس یونیورسٹی کی ڈگری مل چکی تھی لیکن صوتیات و لسانیات کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی اس لیے کچھ عرصے حیدرآباد میں قیام کر کے وہ فرانس چلے گئے تھے اور سار بون یونیورسٹی میں ہند آریائی کی مشہور شخصیت پروفیسر جیولس بلوک سے وابستہ ہو گئے تھے اور اردو زبان کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا۔

ایک ہی زبان کو مختلف علاقوں میں مختلف طریقے سے ادا کیا جاتا ہے۔ زبان بولنے والوں کے درمیان اختلاف بہرحال موجود ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اردو کے دکنی تلفظ اور لب و لہجے پر توجہ مرکوز کی اور یہ ان کے تحقیقی مطالعے کا بڑا دلچسپ موضوع ثابت ہوا انھوں نے صوتی آلات کی مدد سے اصوات کا باقاعدہ مطالعہ کر کے جو نتائج مرتب کیے تھے انھیں انگریزی میں "ہندستانی فونٹکس (Hindustani Phonetics)" کے نام سے موسوم کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی۔ ۱۹۲۷ء میں قیام لندن کے دوران انھوں نے اس موضوع پر کام شروع کر دیا تھا لیکن اس کی تکمیل پیرس میں ہوئی اور یہیں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس زمانے سے لے کر آج تک بھی ماہرین لسانیات اس سے استفادہ کر رہے ہیں اور اس کے حوالوں سے استناد پیش کر رہے ہیں اس کتاب میں ہند آریائی لسانیات کے پروفیسر ڈاکٹر جیولس بلوک کا تعارف موجود ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ کسی زبان کے الفاظ اور اس کی لغات سے متعلق مباحث و مسائل کا تعلق علم اللسان سے ہے۔ ڈاکٹر زور کی تصنیف "ہندوستانی لسانیات" کی بدولت یہ نکتہ لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ لفظیات یا تشکیلیات (Morphology) اور معنیات Semantics) علم زبان اور صوتیات (Phonetics) کی علیحدہ علیحدہ شقیں ہیں، جو الگ الگ مطالعے کی مقتضی ہیں۔ اردو کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر زور کی اولیت مسلمہ ہے۔ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں اردو کے مخصوص صوتیے (Phonemes) کے مخرج اور ادائیگی کو ظاہر کرنے کے لیے تصاویر اور ڈائیگرام (Diagram) سے بھی مدد لی ہے۔ اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جیولس بلوک نے لکھا تھا کہ ایسی کتابیں بہت کم تعداد میں ہیں جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ "ہندوستانی" کا تمام دنیا میں مطالعہ ہوتا رہا ہے

لیکن تجزیاتی انداز میں اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ لسانیات اور اس کی مختلف شاخوں پر ہندی میں گذشتہ چند برسوں سے بہت کام ہو رہا ہے لیکن اُردو والوں نے اس طرف کم توجہ کی ہے۔ اردو کو ڈاکٹر زور اور دیگر ماہرین لسانیات کی تحقیق کو آگے بڑھانے والوں کا انتظار ہے۔ ۱۹۰۷ء میں محمد حسین آزاد نے "سخندان فارس" میں بعض لسانی مسائل کی طرف اشارے کیے تھے لیکن اس کتاب میں محمد حسین آزاد کی معلومات لسانیات کے ایک مخصوص مسئلے یعنی لفظیات سے متعلق ہے۔ اس وقت تک علم زبان کی طرف اُردو کے علماء نے بہت کم توجہ کی تھی۔ محمد حسین آزاد کی اس علم سے فطری لگاؤ تھا انھوں نے سنسکرت فارسی اور اُردو زبان کے الفاظ یا ان کی معنوی تبدیلیوں کی طرف بعض اشارے کیے ہیں اور تلفظ اور لب و لہجے کے اختلاف کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے "سخندان فارس" کو ہم علم لسانیات کی تصانیف میں شمار نہیں کر سکتے۔ یہ اس علم کی طرف سفر کا پہلا قدم ہے"۔ پنجاب میں اُردو" ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی تھی جس میں محمود شیرانی نے زبان کی پیدائش اور اس کے ابتدائی نشوونما اور اس کی جنم بھومی کے متعلق اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے علم تاریخ اور الفاظ کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اُردو زبان کا مبدا رسرزمین پنجاب ہے۔ اُردو کی وجہ تسمیہ، ریختہ اور اس کی قسمیں دہلوی گوجری، دکنی، ہندوستانی اور ہندی و ہندوی کی وضاحت کرتے ہوئے محمود شیرانی نے اُردو کے آغاز سے بحث کی ہے اور قدیم اردو پر پنجابی کے اثر کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں محمد حسین آزاد کے شاگرد احمد دین نے "سرگذشت الفاظ" طبع کی۔ پادری ٹرمپ نے انگریزی فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کا موضوع تشکیلیات یا لفظیات سے متعلق تھا۔ احمد دین نے اسی انداز پر اُردو ہندی فارسی اور عربی الفاظ کا تجزیہ و مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پروفیسر سدھیشور ورما کی کتاب "آریائی زبانیں" بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے اس پر ہندوی زبان، ہندی اور مسلمان، اردو کا آغاز

اور ہندی وار دو نثر کا آغاز جیسی سرخیاں قائم کر کے اردو زبان کے لسانی ڈھانچے کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احتشام حسین کی کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" An Outline of Indian Philology کا ترجمہ ہے جسے ۱۹۴۸ء میں مختصر حواشی کے اضافوں کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اس تصنیف میں ارتقائے لسان کے مختلف مدارج، زبانوں کی گروہ بندی، زبانوں کی خاندانی خصوصیات اور مختلف بولیوں وغیرہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مسعود حسین خان کی "مقدمہ زبان اُردو" اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں اردو کی پیدائش اس کے لسانی خدوخال اور آغاز کے مختلف نظریات کو عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو دلی کے آس پاس بولی جانے والی بولیوں سے نکلی ہے۔ انھوں نے آزاد اور شیرانی کے نظریوں کو غلط ثابت کیا ہے۔ عبدالقادر سروری کی کتاب "زبان اور علم زبان" علمائے لسانیات کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے لکھی گئی ہے اور اس میں علم زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے "اردو زبان کا ارتقاء" شوکت سبزواری کی مبسوط تصنیف ہے جس میں اُردو کے ماخذ اور دوسری زبانوں سے اس کی اثر پذیری جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور کی "ہندوستانی لسانیات" اور "ہندوستانی صوتیات" اُردو کی لسانی تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی اولیت اس میں ہے کہ انھوں نے اُس وقت لسانیات کے موضوع کی طرف توجہ کی جب اردو ہی نہیں ہندی کے علماء کو بھی اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۸ء تک بابو شیام سندر داس کی "بھاشا وگیان" ہندی لسانیات کا کل اثاثہ تھی۔ بقول گیان چند جین "ڈاکٹر زور لسانیات کی دنیا میں بڑی گھن گرج سے آئے وہ نہ صرف اُردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں" علم زبان پر دو مستقل تصانیف "ہندوستانی فونیٹکس" (انگریزی) اور ہندوستانی لسانیات (۱۹۳۲ء) کے علاوہ ڈاکٹر زور نے

اس موضوع پر بعض مضامین بھی سپردِ قلم کیے ہیں" اردو اور پنجابی" "نقوش" لاہور میں ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ "اردوئے معلیٰ" کے لسانیات نمبر (۱۹۶۲ء) میں ان کا ایک اور مضمون" اردو کی ابتدا" بھی طبع ہوا ہے۔ ڈاکٹر زور کی انگریزی کتاب" ہندوستانی فونٹکس" کوئی ضخیم تصنیف نہیں ہے یہ صرف سولہ صفحات پر محیط ہے لیکن اپنے موضوع کی اہمیت اور اس موضوع پر اولین تحریر کی وجہ سے بھی ڈاکٹر زور کا نام لسانیات کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ انھوں نے اس کتاب کو اردو میں منتقل نہیں کیا۔ یہ کتابچہ ۱۹۳۰ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس طویل عرصے میں صوتیات کے علم نے خاصی ترقی کر لی ہے اور اس کا دامن نئی نئی معلومات سے بھر گیا ہے لیکن ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی صوتیات" کے متعلق جو نتائج اخذ کیے تھے اردو دان طبقے کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھے اور وہ پہلی بار صوتیات پر لکھی ہوئی کسی باقاعدہ تصنیف سے روشناس ہوئے تھے لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں اصوات کا تجزیہ کرنے کے جو آلات اس زمانے میں موجود تھے ان کی مدد سے ڈاکٹر زور نے ہندوستانی کا تجزیہ کیا تھا اور ان ہی نتائج کی رہنمائی میں انھوں نے اپنے مقالے کی تکمیل کی تھی ہندوستان کی آوازوں کے تجزیے کا کام پہلی مرتبہ ڈاکٹر زور کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا اور اس کی اولیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ہندوستانی فونیٹکس کے تمہیدی باب میں ڈاکٹر زور نے زبان کے آغاز سے متعلق اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا ہے جس کی رو سے اردو، پنجابی اور کھڑی بولی کے ماخذ سے تشکیل پائی ہوئی بولی قرار دی گئی ہے اور ڈاکٹر زور بارھویں صدی سے قبل مغرب میں صوبۂ سرحد سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک کے علاقے کو اس کا زیرِ اثر تصور کرتے ہیں۔ اس نظریے سے اختلاف کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ چنانچہ شوکت سبزواری اور مسعود حسین خان نے اس نظریے کی مکمل تائید نہیں کی ہے۔ اس باب کے دوسرے جزو میں

مصنف نے شمالی بولیوں اور دکنی کے اختلاف کو واضح کیا ہے اور پہلی بار دکنی زبان کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں انھوں نے نہ صرف صرف و نحو کے فرق کو نمایاں کیا ہے بلکہ صوتی اختلاف کو بھی سائنٹفک انداز میں ظاہر کر دیا ہے اور اس طرح آیندہ نسل کے لیے مستقبل میں صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے ضروری معلومات اکٹھا کر دی ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے باب کا انداز تجزیاتی ہے یعنی اردو کی مختلف اصوات کو لے کر ان کا علٰحدہ علٰحدہ صوتی تجزیہ کیا گیا ہے، جس کا نتیجہ ڈاکٹر زور نے یہ اخذ کیا ہے کہ اردو میں نو مصوتے اور چھ جڑواں مصوتے (Dipthong) ہیں۔ ڈاکٹر زور نے بعض حروف کی ہاکاری شکلوں (Aspirated Forms) کو بھی علٰحدہ مصوتہ قرار دیا ہے جیسے ڈھ، ڈھ، رھ، ڑھ اور نوہ وغیرہ۔ ڈاکٹر زور سے قبل کسی عالم نے انھیں علٰحدہ مصمتے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا۔ انھیں مفرد آوازوں کے بجائے مرکب تصور کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ایک اور اجتہاد یہ کیا کہ ہندی کے کچھ کو بھی ایک مستقل مصمتے کے طور پر تسلیم کیا ہے اور مختلف علاقوں میں اس میں جو تبدیلیاں واقع ہوں ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر زور اردو کے وہ پہلے ماہر صوتیات ہیں جنھوں نے سائنسی آلات اور پیلیٹو گرام (Palatograme) کی مدد سے اصوات کی ادائگی کو باضابطہ طور پر ظاہر کیا ہے۔ پیلیٹو گرام تالو کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو مختلف آوازوں کے مخرج کے مقام کو ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا ایک علمی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آوازوں کے اختلاف کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ اور سائینی آلات کی مدد سے ظاہر کیا ہے اور اس مقصد کے لیے کائموگراف سے بھی مدد لی ہے۔ ڈاکٹر زور نے یہ تجربہ بڑی احتیاط اور دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے اور اس سے ان کے علمی شغف اور مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کے معیاری تلفظ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ بعض آوازیں لفظ کی ابتدا میں تو واضح ہوتی ہیں جیسے "ت" لیکن لفظ کے درمیان

یا آخر میں جب انھیں ادا کیا جاتا ہے تو ابتدا ء کی بہ نسبت کم واضح ہوتی ہیں جیسے تارہ تم، تین اور تب وغیرہ میں ت کی آواز واضح ہے لیکن لفظ کے درمیان اور آخر میں ت کی آواز ذرا کم زور سی محسوس ہوتی ہے اسی طرح جب لفظوں کے درمیان میں تھ یا دھ آجاتے ہیں تو ان متنفس مصمتوں کی ادائیگی ہلکی پڑ جاتی ہے۔ ایک اور نتیجہ ڈاکٹر زور نے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی لفظ کے آخر میں چ آجائے تو اس کی آواز خفیف ہو جاتی ہے مثلاً چار چاند، چراغ چوک اور چور میں چ کا تلفظ واضح ہوتا ہے جب کہ آخر میں جیسے پانچ، کانچ، ناچ اور چھاچ وغیرہ میں یہ صورت مختلف ہوتی ہے لیکن اس کے برخلاف درمیانی ٹ ابتدائی ٹ کی بہ نسبت شدت سے ادا کی جاتی ہے جیسے ٹوٹنا، ٹم ٹم، ٹاٹ اور ٹب وغیرہ میں ٹ کی ادائیگی میں وہ شدت نہیں جو ٹھاٹ، گھاٹ، چاٹ اور نٹ کھٹ وغیرہ میں ٹ کی آوازیں محسوس ہوتی ہیں یہ زیادہ واضح اور مکمل ہوتی ہے۔

مرکب الفاظ کی آوازوں سے بھی ڈاکٹر زور نے علٰحدہ بحث کی ہے جو بڑی باریک بینی کا کام ہے مثلاً یہ کہ کتبہ میں ت کی آواز "ڈ" اور پیچ دار میں چ کی آواز ج کی مانند ادا ہوتی ہے وغیرہ

"بل" اور "سر" "لہر" بھی صوتیات کے اہم موضوعات ہیں ان کی پہچان اور ان پر تبصرہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور وہ پہلے ماہر صوتیات ہیں جنھوں نے ہماری زبان میں بل اور سر لہر پر روشنی ڈالی ہے اس موضوع پر اگر دوبارہ کسی نے قلم اٹھایا ہے تو ڈاکٹر مسعود حسین خان ہیں جنھوں نے ڈاکٹر زور سے چوبیس سال بعد اپنی انگریزی کتاب میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر زور تاریخی لسانیات سے کم اور تجزیاتی لسانیات سے زیادہ طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ لسانیات اور بالخصوص صوتیات پر ڈاکٹر زور کے تحقیقی کام کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر اس وقت اظہار خیال کیا جب اس

دشت پرخار میں کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ کتاب کے حصہ دوم میں ہندوستانی کے آغاز وارتقا سے متعلق مفید اور بصیرت افروز معلومات پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر زور کی ناقابل فراموش تصنیف "ہندوستانی لسانیات" میں دنیا کی مختلف زبانوں کو گروہوں میں تقسیم کرکے ان کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق دلچسپ بحثیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں آٹھ ابواب ہیں جو لسانیات اور علم زبان کے تمام اصولوں، اس کی تعریف اور اہمیت وغیرہ سے متعلق ہیں اس علم کے آغاز وارتقا کے مختلف اہم مراحل کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں زبان کی پیدائش اس کی ماہیت، تشکیلی منازل اور لفظوں کے ترتیب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے تیسرا باب زبان کے ارتقا سے متعلق ہے اس میں ان مختلف عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ صوتی تغیر زبان کے ارتقا کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایک زندہ زبان نشوونما پاتی اور وسعت حاصل کرتی ہے اور اس میں تغیرات کا رونما ہونا ایک فطری عمل ہے اس باب میں صوتی تغیرات کی تمام مثالیں ڈاکٹر زور نے اردو زبان سے دی ہیں اور ادغام کی تشریح کرتے ہوئے اس کی مختلف صورتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ پانچویں باب میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ زبان کی صورت گری میں جہاں علماء کا حصہ ہوتا ہے وہیں عوامی اثرات بھی دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوتے ہیں۔

ہندوستانی لسانیات کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے ناگزیر ہے جو ہند آریائی کے ارتقا اور اس کے تعمیری مدارج سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے زیادہ تر تاریخی تفصیلات سے سروکار رکھا ہے اور اس کے توضیحی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں کی ہے اردو زبان کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے اس وقت تک اس کے

بارے میں ماہر لسانیات نے جو نظریات پیش کیے ہیں ان کا تجزیہ کر کے اُردو کے آغاز سے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اُردو شعراء کے قدیم تذکرے فارسی میں لکھے گئے تھے اور ان میں ضمناً اُردو کے آغاز کا ذکر کیا گیا تھا اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے "گلزارِ ابراہیم" "نکات الشعرا" "مخزنِ نکات" اور "تذکرۂ شعرائے اُردو" وغیرہ کے حوالے دیے ہیں اور انشاء کی "دریائے لطافت" کے بیانات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے صرف ہندوستانی مصنفین کے خیالات کی ترجمانی ہی نہیں کی ہے بلکہ جان گلگرسٹ پروفیسر ٹرنر، شکسپیئر، گراہم بیلی، گارساں دتاسی، فاربس، جولس بلوک، اسپرنگر، اسٹی وارٹ او گریرسن کی اُردو دوستی کا ذکر کرتے ہوئے، اُردو کے آغاز کے بارے میں ان کے خیالات سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبداللطیف شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، حافظ محمود شیرانی اور سنتی کمار چٹرجی کے بیانات سے بھی قاری کی معلومات میں اضافہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام مصنفین میں سے صرف موخر الذکر دو ادیب ہی لسانیات کے ماہرین تصور کیے جاتے ہیں اور ہند آریائی کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں ان کے بیانات کو اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہماری زبان کے آغاز کا جو نظریہ اس کتاب میں پیش کیا ہے اس سے تمام لسانیات کے عالم متفق نہیں ہیں سلیمان ندوی نے سندھ کو اردو کی جنم بھوم قرار دیا ہے۔ انھوں نے تاریخی شواہد ضرور پیش کیے ہیں لیکن لسانی ثبوت مہیا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ دوسری طرف محمود شیرانی پنجاب کو اُردو کا گہوارہ بتاتے ہیں جس کی رو سے قدیم پنجابی اور دکنی بنیادی بولی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے محمود شیرانی نے لسانی شہادتوں سے اپنے نظریے کی تائید کی ہے۔ گراہم بیلی بھی اس خیال سے کسی حد تک متفق ہیں۔ ایک تیسرے گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اُردو مغربی ہندی کی ایک بولی ہے اور اس کا حلقہ اثر دہلی سے میرٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کا اپنا ایک مخصوص نظریہ ہے وہ اُردو کو نہ تو پنجابی سے مشتق قرار دیتے ہیں اور نہ مغربی ہندی کی بولی

تصور کرتے ہیں انھوں نے لکھا ہے:۔

"اُردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا سرچشمہ تھی۔"

اردو کی جنم بھومی کے بارے میں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔" ڈاکٹر زور کا یہ نظریہ خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ

"اُردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کے فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔"

ڈاکٹر زور کے ان بیانات کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص حد تک شیرانی کے ہمخیال بھی ہیں اور مدھیہ دیس کے نظریے کی تردید بھی نہیں کرتے بلکہ ان دونوں نظریات میں ربط پیدا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں ادبی بولیوں مثلاً گجراتی، دکنی اور شمالی ہند کی بعض بولیوں کی تفصیل موجود ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صوتی اختلافات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ بعد کے ابواب میں ڈاکٹر زور نے شمالی ہند میں اُردو کی نشو و نما کا حال قلمبند کرتے ہوئے مظہر جان جاناں کی لسانی خدمات، اُردو شاعری میں دکنی عنصر کے زائل ہونے اور اس کی جگہ فارسی لفظیات اور اسالیب کے رونما ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر زور کی یہ کتاب بہت سی یونیورسٹیوں میں شاملِ نصاب کر دی گئی تھی۔ اس وقت تک لسانیات کے موضوع پر اُردو میں کوئی مبسوط تصنیف موجود نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور اُردو کے ان اولین ماہر لسانیات میں سے ہیں جنھوں نے ہمارے ادب کے سرمایے میں اس اچھوتے موضوع پر اظہارِ خیال

کرکے نئی نسل کے لیے اس مسئلہ پر غور وخوض کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور ایک وقیع اور قابل قدر تصنیف کا اضافہ کیا ہے۔ آج بھی ادب کے طالب علم صوتیات اور لسانیات پر ڈاکٹر زور کی کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ گیان چند جین نے ڈاکٹر زور کو اُردو لسانیات کا "ابوالآبا" کہا ہے جو بہت مناسب اور درست معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "ادبی بولیاں" کے زیر عنوان گجراتی اور دکھنی کے اختلاف کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک گجراتی اور دکھنی کو ایک ہی بولی تصور کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر زور نے ان میں صوتی اور لسانی بنیادوں پر امتیاز قائم کیا ہے اور ان کی منفرد حیثیت کی تشریح کی ہے۔ یہاں انھوں نے شمالی ہند اور جنوب میں بولی جانے والی اُردو کے اختلافات بھی واضح کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ علم لسانیات اور صوتیات میں ڈاکٹر زور کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

افسانہ نگاری

بلند قامت محقق ڈاکٹر زور ان اولین مصنفین میں سے ہیں جنھوں نے اُردو ادب میں تنقید نگاری اور افسانہ نویسی کے ابتدائی نقوش ابھارنے میں اہم حصہ لیا ہے ڈاکٹر زور کے علمی اور تحقیقی شغف نے انھیں افسانہ نگاری اور شاعری کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔ آج بہت سے حضرات جو اُردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ ڈاکٹر زور ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ایم اے میں زیر تعلیم تھے چنانچہ "طلسم تقدیر" کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ ماہ شعبان ۱۳۴۴ھ میں انھوں نے یہ قصہ قلمبند کیا تھا جو رسالہ "ارتقا" (سکندر آباد) کے مدیر افضل شریف کی فرمایش پر لکھا گیا تھا اور جسے افضل شریف نے بڑے اہتمام کے ساتھ طبع کروایا تھا۔ پہلا ایڈیشن عبدالقادر سروری کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ "طلسم تقدیر" میں خوش قسمت فیاض الدین کے حالات کا مطالعہ ہم کو میر امن کی "باغ وبہار" کے قصوں کی یاد دلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طویل مختصر افسانہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے داستان اور افسانے کی درمیانی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ گوئی کا انداز بھی داستانوی اثر سے آزاد نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں فوق الفطرت واقعات کے بجائے روزمرہ زندگی کے تجربات کی عکاسی کی گئی ہے۔ خوش قسمت فیاض الدین کے حالات کی تہ میں کسی خوش نصیب درویش کی سیر کا عکس نظر آتا ہے۔

رضیہ کے ساتھ فیاض الدین کی ڈرامائی شادی بھی خاصی دلچسپ ہے۔ "طلسم تقدیر" میں دو بھائیوں کی روداد بیان کی گئی ہے۔ یہ افسانہ زوال گولکنڈہ کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے پہلی بار گولکنڈہ کے نیم تاریخی واقعات کو افسانوی انداز میں دلچسپ اور بصیرت افروز بنا کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طویل مختصر افسانہ باون صفحات پر مشتمل ہے منظر نگاری اور پُر اثر طرز تحریر نے "طلسم تقدیر" کو دلکش بنا دیا ہے۔ فیاض الدین عقلمند ہے اس لیے خوش قسمتی اس کے قدم چومتی ہے اس کے برخلاف اس کا بھائی کمال سادہ لوح ہے اور اپنی نادانی کی وجہ سے مصیبتوں کا شکار رہتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "طلسم تقدیر" میں یہ بتایا ہے کہ انسانی تدبیر تقدیر کو متعین کرتی ہے۔ فیاض کی خوش بختی اس کی عقلمندی اور کمال کی بدنصیبی اس کی بیوقوفی کا نتیجہ تھی۔ دو بھائیوں کی یہ کہانی ٹینی سن (Tennyson) کی Enoch Arden کی یاد دلاتی ہے جس میں سلاس مارنر (Silas Marner) کو نیک نیتی کے باوجود مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر زور کے افسانوں کے مجموعے "سیر گولکنڈہ" کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اسے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ اس تصنیف کی ہر دل عزیزی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے قصے مقامی رنگ کے حامل تھے جس سے فطری طور پر انسان کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے بعد "گولکنڈے کے ہیرے" زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کے افسانوں کے کردار بھی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر زور نے "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" کے نام سے اس تاریخی شہر پر ایک کتاب مرتب کر کے شائع کروائی تھی۔ "فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے دوسرے حصے" روایات" میں بیس افسانوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور کے بائیس افسانے مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں "چلم کی رقاصہ"، "مشک محل"، "مکہ مسجد"، "کھویا ہوا چاند"

"ننھی مانو"، "بیس پیسے"، "پانچ اشرفیاں"، "ملک خوشنود"، "شہزادی کا عقد"، "کوہ نور"، "شعلۂ انتقام"، "سرو صحرا"، "انار کے چودہ دانے"، "اورنگ زیب و تاناشاہ"، "کاغذی برج"، "غیبی امداد"، "آخری سرفروش"، "مٹی کی کلیا"، "خاصے کا وقت"، "دفینہ" اور "طلسم تقدیر" ڈاکٹر زور کے ایسے افسانے ہیں جو تاریخ گولکنڈہ کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں اور جن کا مقصد ایک گزرے ہوئے عہد کی صالح روایات کی یاد تازہ کرنا اور اسلاف کے شاندار کارناموں اور ان کے بلند کردار اور تدبیر و عظمت سے نئی نسل کو روشناس کروانا ہے چنانچہ ڈاکٹر زور اپنی افسانہ نگاری کی تہہ میں جو مقصد پوشیدہ ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگی نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پر تکلف آرائش و زیبائش کے علاوہ بازاری اور پست مکانوں میں رہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہو سکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کیے جائیں جن پر اس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت و آرام کا انحصار تھا ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند اور پختہ تھا۔ نیک نیتی خلوص اور ہمدردی ان کی زندگی کے اصلی مقاصد تھے۔ مذہبی رواداری اور امن پسندی ان کی گھٹی میں پڑی تھی قلب و دماغ کی آزادی جتنی ان کو نصیب تھی موجودہ نسلوں کو شاید ہی نصیب ہو سکے غرض جب تک ان خوبیوں کے خاص نمونے اور ان کے اسباب و علل نہ پیش کیے جائیں ہماری تاریخیں اور درسگاہیں بیکار ہیں۔ . . . گولکنڈہ کے یہ تاریخی افسانے اسی نقطۂ نظر سے لکھے جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر زور نے اسی نقطۂ نظر سے اپنے تمام افسانے قلمبند کیے ہیں۔

ڈاکٹر زور کے افسانوں کے پلاٹ سادہ لیکن مربوط اور دلچسپ ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاری میں قصہ گوئی کی جو نئی تکنیک استعمال کی جارہی ہے اس کی تلاش ڈاکٹر زور کے افسانوں میں کرنی بے سود ہے۔ یہ اُردو افسانہ نگاری کا دورِ طفولیت تھا۔

ڈاکٹر زور نے اپنے افسانوں کا مواد دکن کی قدیم تاریخوں، یادداشتوں، غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں اور زبانی روایات (Oral Traditions) سے حاصل کیا ہے "تاریخِ فرشتہ" "حدیقۃ السلاطین"، "ماہ نامہ"، "تاریخ طغرہ"، "تاریخ گولکنڈہ" "سیاحت نامہ تھیونو"، "وقائع سیر و سیاحت برنیر" اور "برہان مآثر" جیسے تاریخی مآخذوں سے انھوں نے استفادہ کیا تھا اور اپنے افسانہ کی پیشکش میں ان سے مدد لی تھی۔ ڈاکٹر زور تاریخ سے چند بلیغ اشارے منتخب کرکے ان سے اپنے کرداروں میں تاریخی حقیقت پسندی کے عنصر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کے ادبی و تاریخی شعور اور ان کے سلیقے و ذکاوت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار سچے اور حقیقی انسان معلوم ہوتے ہیں اور اپنی خوبیوں اور انسانی کمزوریوں کے ساتھ وہ قاری کو متاثر کرتے اور اس کے ذہن پر ایک دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے گولکنڈے کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ کا کردار بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔ اسی طرح حیات بخشی بیگم، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی شخصیتوں سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور افسانہ پڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ قطب شاہی عہد میں پہنچ گیا ہے۔ ان تاریخی کرداروں سے نئی نسل کو اس ذہانت و مہارت کے ساتھ متعارف کروانے کا سہرا ڈاکٹر زور کے سر ہے۔ یہ بھی ان کا کوئی معمولی ادبی کارنامہ نہیں کہ انھوں نے بکھرے ہوئے مواد، منتشر حقایق اور ماضی کی ڈوبتی ہوئی پرچھائیوں کو مرتب و منظم کرکے انھیں حقیقی زندگی کا ایک جزو بنا دیا ہے اور ادب کے صفحات میں جگہ دے کر انھیں زندگی جاوید عطا کی ہے۔ طویل و بسیط

تاریخوں کی ورق گردانی سے ہمیں وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو ان ہلکے پھلکے پرلطف اور دلچسپ افسانوں میں محفوظ کردی گئی ہے۔ قطب شاہی سلاطین، قطب شاہی کلچر اور قطب شاہی روایات سے ڈاکٹر زور کی جو والہانہ وابستگی تھی اس کا ایک ثبوت ان کے یہ افسانے بھی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے وقت کے گرد و غبار کو ہٹا کر ان سے گولکنڈے کے ایسے آبدار ہیرے برآمد کیے ہیں جن کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قطب شاہی عہد کی بازیافت اور بازآفرینی ڈاکٹر زور کے ادبی اور علمی مشاغل کا حاصل اور ان کا مقصدِ حیات تھا جس کی تکمیل انھوں نے کبھی "میر محمد مومن" کبھی "کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" لکھ کر کرنی چاہی تو کبھی افسانوی انداز میں اس کی عکاسی کرکے "گولکنڈے کے ہیرے" اور "سیر گولکنڈہ" جیسی دلچسپ اور وقیع کتابیں لکھ کر شائع کیں اور اس جذباتی وابستگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ "میر محمد مومن" کے دیباچے میں ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں :۔

> "حیات محمد قلی قطب شاہ اور نیم تاریخی افسانوں کے مجموعوں گولکنڈے کے ہیرے اور سیر گولکنڈہ کی ترتیب سے مولف کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس قسم کے ضروری موضوعوں کی طرف لوگ متوجہ ہوں اور ملک کی شائستگی اور رواداری کے قدیم ترین سبق کا اعادہ کریں۔ موجودہ سیاسی اور فرقہ واری کشمکش کے تصفیے میں اس آموختے سے یقیناً مدد ملے گی۔"

"سیر گولکنڈہ" بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو تاریخ گولکنڈہ کے پس منظر میں ۱۰۱۰ھ سے ۱۰۹۸ھ کے واقعات پر سلسلہ وار افسانوں کا گلدستہ ہے جن کی ترتیب یہ ہے "مشک محل" (۱۰۱۰ھ)، "مکہ مسجد" (۱۰۲۳ھ)، "کھویا ہوا چاند" (۱۰۳۶ھ) "ملک خوشنود" (۱۰۴۵ھ) "شہزادی کا عقد" (۱۰۷۵ھ) "انار کے چودہ دانے" (۱۰۹۰ھ)، "اورنگ زیب و تاناشاہ" "کاغذی برج"، "آخری سرفروش" "خاصہ کا وقت" اور "مٹی کی گلہیا"۔ آخری چھ افسانے ۱۰۹۸ھ

یعنی سقوط گولکنڈہ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"مشک محل" کا پلاٹ خاصا ڈرامائی ہے۔ گولکنڈے کا بادشاہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار، تفریح کے لیے نکلتا ہے۔ ایک امیر کے زیر تعمیر محل کے قریب تاجروں کے خیموں کو نصب دیکھ کر یہاں ان کے طویل قیام کا سبب دریافت کرنا چاہتا ہے جب وہ آگے بڑھتا ہے تو ملک التجار سے گفتگو کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ مشک کے ان سوداگروں کی مشک کا سودا نہیں ہو سکا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ محل کو واپس ہوتا ہے اور توشہ خانے کے داروغہ کو حکم دیتا ہے کہ ان سوداگروں کی مشک خرید لی جائے۔ داروغہ عرض کرتا ہے کہ پہلے ہی توشہ خانے میں مشک کے انبار لگے ہوئے ہیں تو بادشاہ حکم دیتا ہے کہ اُس امیر کے زیر تعمیر محل کی بنیادوں میں مشک ڈال دی جائے جہاں سوداگروں کا قافلہ قیام پذیر ہے۔ اس دن سے امیر کا یہ محل مشک محل کہلانے لگا۔

وحدت تاثر کے اعتبار سے ڈاکٹر زور کے افسانے خاصے کامیاب معلوم ہوتے ہیں اس کی ایک اچھی مثال "مکہ مسجد" ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ اعلان کرتا ہے کہ "مکہ مسجد" کا سنگ بنیاد وہ شخص رکھے گا جس نے بارہ سال کی عمر سے ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ کی ہو۔ ہزاروں کے مجمع میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جو اس معیار پر پورا اترتا ہو۔ اب خود بادشاہ آگے بڑھتا ہے۔ یہاں بڑی چابک دستی کے ساتھ افسانہ نگار نے ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے۔ محمد قطب شاہ مجمع کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

> اس خدائے یگانہ و بزرگ کی قوت و دبدبہ کی قسم جس کے گھر کی بنیاد ڈال رہا ہوں میری بارہ سال کی عمر سے اس وقت تک پنج وقتہ نماز کسی وقت قضا نہیں ہوئی ہے اور اسی طرح میری تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی۔

"کھویا ہوا چاند" میں ملکہ حیات بخشی بیگم کے دور کی سماجی اور تمدنی زندگی کی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ اس میں ممتا کی تڑپ کو بڑے موثر اور دلکش پیرائے میں پیش کیا

گیا ہے۔ شہزادہ عبداللہ قطب شاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم نے جب یہ خبر سُنی کہ سواری خاص کا ہاتھی مورت مست ہو گیا ہے اور اس نے مہاوت کو پاؤں سے کچل ڈالا ہے اور شہزادہ عبداللہ کو لے کر جنگل کی طرف بھاگ گیا ہے تو ان کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ محل میں سب کا کھانا پینا بند ہو گیا۔ منتیں مانی جانے لگیں، غربا اور محتاجوں میں شاہی باورچی خانے سے کھانا تقسیم ہونے لگا۔ اور پریشان ماں نے خیرات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ چار دن گذر گئے اور شہزادے کا پتہ نہ چل سکا۔ ایک دن یہ خبر ملی کہ مورت حیات نگر کی جانب سے بے تحاشا دوڑتا ہوا گذرا ہے۔ اور لاکھ جتن کرنے پر بھی تعاقب کرنے والوں کے قابو میں نہ آسکا ہے تو حیات بخشی بیگم کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسی عالم تشویش میں محرم کا چاند نظر آیا۔ ملکہ جھروکے سے باہر کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی کہ آسمان پر ہلال محرم دکھائی دیا اور اس کو دیکھتے ہی حیات بخشی بیگم کو اپنا کھویا ہوا چاند یاد آگیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے حضرت امام حسین سے عرض کی کہ اگر شہزادہ عبداللہ قطب شاہ صحیح و سالم محل تک پہنچ جائے تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے پہلے چالیس من سونے کی زنجیر ہاتھی کے پاؤں میں اور شہزادے کی کمر میں باندھ کر قلعۂ گولکنڈہ سے مکان حسینی علم تک پاپیادہ لے جاؤں گی اور سونا سادات اور غربا میں تقسیم کر دوں گی۔ دوسرے دن صبح ملکہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کی گئی کہ شہزادہ ہاتھی پر سوار محل کی جانب بڑھ رہا ہے اور مورت کی مستی اتر چکی ہے اور وہ مطیع ہو چکا ہے۔

"کھویا ہوا چاند" میں یہ بتلایا گیا ہے کہ شہزادے کی آمد پر ملکہ نے کس طرح اپنی منت پوری کی اور کس طرح اس واقعے کے بعد سے ہر سال محرم میں عقیدت مندوں کی طرف سے حسینی علم برآمد ہونے کے موقعے پر لنگر نذر کیے جاتے ہیں۔

"ملک خوشنود" میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ وجہی، محمد قلی کا بچپن کا ندیم اور مقرب خاص

تھا۔ تخت نشینی کے بعد بادشاہ نے اس کو خطاب سے سرفراز کیا اور بیش قرار تنخواہ مقرر کر کے "قطب مشتری" لکھنے پر مامور کیا تھا۔ آگے چل کر وہ رقمطراز ہیں کہ بھاگ متی نے بھی وجہی کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا۔ بھاگ متی جب دربار میں آتی تھی تو ایک ہزار سوار اس کے ساتھ موجود ہوتے تھے۔ یہ روایت ڈاکٹر زور نے "طبقات اکبر شاہی" (سنہ ۱۵۹۵ء/۱۰۰۳ھ) کے مورخ نظام الدین احمد کے تتبع میں بیان کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھاگ متی ایک افسانوی کردار ہے جس کا صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ افسانے میں ملک خوشنود کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ خدیجہ سلطان کے جہیز کے ایک سو زر تر ین کمر غلاموں میں شامل تھا اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ملک الشعراء وجہی کی تیمارداری کے لیے اسے منتخب کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے "ملک خوشنود" میں "حوض کٹورہ" کو قطب شاہی دور کے ایک ادبی مرکز کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ شعراء کے مختلف گروہ "حوض کٹورہ" کی مختلف سمتوں کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے جیسے ملا وجہی کا گروہ حوض کٹورہ کا "مغربی حلقہ" کہلاتا تھا۔ احمد گجراتی کا حلقہ جنوبی گروہ کہلاتا تھا لیکن احمد گجراتی کی وفات کے بعد ملا غواصی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ڈاکٹر زور نے ملا احمد گجراتی کو جو الزنگ شاعر بنایا ہے لیکن اس کی مثنوی "یوسف زلیخا" سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی اور لکھتے ہیں کہ وجہی اور غواصی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملا احمد کے بعد غواصی جنوبی حلقے کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا تھا اور مغربی حلقے میں وجہی اسے اپنا حریف سمجھنے لگا تھا۔ یہ افسانہ ادبی معلومات سے پُر ہے اور افسانہ نگار نے اس عہد کے شاعروں کی باہمی نوک جھونک اور ان کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر زور کہتے ہیں کہ ملک خوشنود وجہی کا شاگرد تھا اور زر یں کمر غلاموں کے ساتھ شہزادی خدیجہ سلطان کی پالکی کے ساتھ بیجاپور تک پیدل روانہ ہوا تھا لیکن بیجاپور میں اس کی قسمت اور شاعرانہ صلاحیتیں ایسی چمکیں کہ خواجہ سراؤں کے زمرے سے نکل کر شاعروں کے حلقے میں داخل

ہو گیا اور ملکہ کی عنایات کی وجہ سے بیجاپوری دربار کی روح رواں بن گیا۔ محمد عادل شاہ کو بے وفا خواص خان کے پنجے سے رہائی دلانے میں بھی ملک خوشنود کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہی کے مشورے پر اس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے مدد طلب کی تھی اور اسی کی تدبیر سے قطب شاہی فوجوں کے ذریعے سے خواص خان کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ اس کامیابی سے خوش ہو کر سلطان بیجاپور نے ملک خوشنود کو خاص اعزاز عطا کیا تھا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی امداد کا شکریہ ادا کرنے گرانقدر ہدایا اور تحائف کے ساتھ حیدرآباد روانہ کیا تھا۔ بادشاہ نے ملک الشعراء غواصی کو حکم دیا تھا کہ وہ حسین ساگر کے "کٹے" تک جا کر ملک خوشنود کا استقبال کریں۔ لیکن غواصی کو یہ بات گراں گذری تھی کہ کل تک حیدرآباد میں جو ایک معمولی غلام کی حیثیت رکھتا تھا اور وجہی کا معمولی شاگرد تھا اس کو اس عزت و تکریم کے لائق سمجھیں چنانچہ وہ خرابی صحت کا عذر کر کے گھر بیٹھ گیا۔ ملک خوشنود نے دربار میں داخل ہو کر بادشاہ کی مدح میں ایسا قصیدہ پڑھا کہ سب دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ملک خوشنود کے مشورے سے غواصی کو گولکنڈے کے سفیر کی حیثیت سے شاہی تحائف اور بیش بہا ارمغان کے ساتھ بیجاپور کے بادشاہ کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دینے بھیجا گیا تھا۔ تاریخ دکن میں ان واقعات کی طرف اشارے ضرور موجود تھے لیکن ڈاکٹر زور نے قصے کے پیرائے میں پیش کر کے انھیں بہت دلچسپ اور موثر بنا دیا ہے۔ "سیر گولکنڈہ" کے افسانے قاری میں تاریخی شعور اور ادبی بصیرت پیدا کرتے ہیں۔

"شہزادی کا عقد" میں گولکنڈے کی ثقافت کی اچھی عکاسی کی گئی ہے سلاطین کے دل میں فقراء صوفیاء سے عقیدت و احترام کا جو جذبہ کارفرما تھا اس کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ دربار گولکنڈہ میں فقراء اور صوفیوں کا بھی اثر و رسوخ تھا اور خود بادشاہ ان کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اس افسانے کو اسی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے اور قطب شاہی

دور میں شادی کی مختلف رسومات کا بھی پر لطف حال قلمبند کیا گیا ہے۔ ساچق کے جلوس کا یہ سماں ملاحظہ ہو:

> دیکھتے دیکھتے ساچق کا دن آ گیا اور در اصل اسی رسم سے شادی اور اس کی دلچسپیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے شاہی فوج کا جلوس، طرح طرح کے باجوں کا ہنگامہ اور پھر سینکڑوں نازک اندام اور شوخ و شنگ کا مٹنوں کے سر پر ساچق کی زنگارنگ تھلیوں کا قلعہ سے شہر کی طرف جانا ایک ایسا سماں پیدا کرتا تھا جس کو زبان قلم سے بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ جہاں تک نظر دوڑتی ہے یہی رنگین سبو چے قطار در قطار (سر پر لیے چلنے والیوں کی مستانہ رفتار کے ساتھ) ایک ذخار سمندر کی سست موجوں کی طرح حرکت کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

ڈاکٹر زور نے یہ بتلایا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے بڑے داماد سید احمد اور سید سلطان میں جو نوشہ بننے والے تھے شدید مخالفت تھی اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ سید سلطان ان کا ہم زلف بنے۔ ملکہ کی مخالفت اور سید احمد کے اعتراضات کو بادشاہ نے ٹال دیا تھا لیکن جب انھیں اطلاع ملی کہ سید احمد ہاتھ میں خنجر لیے بیٹھے ہیں کہ جوں ہی دولھا دیوان خانے میں داخل ہوگا وہ اپنا کام تمام کریں گے۔ تو انھیں فکر دامن گیر ہوئی اور انھوں نے اس گتھی کو سلجھانے کے لیے شاہ راجو سے مشورہ کیا جنھوں نے ابوالحسن کا نام پیش کیا۔ ابوالحسن ملکہ کے رشتہ دار بھی تھے۔ سب رضامند ہو گئے اور اس طرح شاہ راجو کی پیشین گوئی پوری ہوئی کہ عبداللہ کے بعد ابوالحسن قطب شاہی تخت پر بیٹھے گا۔ سید احمد اس ناکامی پر برافروختہ ہو گیا اور اورنگ زیب کے یہاں پہنچ گیا جو اس وقت شہر اورنگ آباد کی آرایش میں مصروف تھا۔ تاریخی معلومات کی سلیقے کے ساتھ افسانوی انداز بیشکش نے اس افسانے کی افادیت کو بڑھا دیا ہے "سیر گولکنڈہ" ایک عرصے تک حیدر آباد کے تعلیمی نصاب کا جز رہی ہے۔

"انار کے چودہ دانے" میں ڈاکٹر زور نے یہ بتلایا ہے کہ شاہ راجو اپنے دیرینہ مرید ابوالحسن تاناشاہ کی درازی عمر و اقبال کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنے ایک فقیر چندر شاہ کے ذریعہ سے ابوالحسن کو ایک انار بھیجا تھا کہ وہ اس کے تمام دانے کھا لیں لیکن ابوالحسن کو انار کھٹا لگا اور اس نے صرف چودہ دانے چکھے۔ جب فقیر چندر شاہ نے شاہ راجو کو اس سے آگاہ کیا تو انھوں نے افسوس ظاہر کیا اور کہا "اس کی قسمت میں چودہ سال ہی کی حکومت تھی" تاریخ دکن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالحسن تاناشاہ نے چودہ سال حکومت کی اور اس کے بعد معزول کر دیا گیا تھا اور قلعہ دولت آباد میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

گولکنڈے کے آخری بادشاہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کا کردار ڈاکٹر زور نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ خاصا جاندار کردار ہے اور قاری کے ذہن پر اپنا ابدی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ تاریخ نے ابوالحسن تاناشاہ کی شخصیت کے چند مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا لیکن ڈاکٹر زور نے اس آخری تاجدار گولکنڈہ کی سیرت کی مکمل عکاسی کی ہے۔ "اورنگ زیب اور تاناشاہ" میں ڈاکٹر زور نے ابوالحسن تاناشاہ کی وسیع المشربی کا ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ قلمبند کیا ہے کہ کس طرح قلعہ گولکنڈہ کے محاصرے کے دوران اورنگ زیب اور ان کے ساتھیوں نے نماز ادا کرنے کے لیے وہ جگہ منتخب کی جو قلعہ کے عین سامنے تھی۔ قطب شاہیوں نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا کہ مغل لشکر ہمارے تیراندازوں اور بندوقچیوں کو اتنا نااہل سمجھتا ہے کہ ہمیں ذلیل کرنے کے لیے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے۔ قطب شاہی گل انداز نے جب دو اشخاص کو نذرِ اجل کر دیا تو خود اورنگ زیب امامت کے لیے آگے بڑھے شاہی نشانہ باز بندوق چلانا ہی چاہتا تھا کہ ابوالحسن تاناشاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"ظالم کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب

اس وقت امام ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ مغل فوجیں ایک عرصے دراز سے قطب شاہی علاقوں پر حملے کر رہی تھیں اور اب تو اورنگ زیب چھ مہینے سے قلعہ گولکنڈہ کا سخت محاصرہ کر لیا تھا اور ابوالحسن اپنے وفادار سپاہیوں کے ساتھ قلعہ بند ہو کے رہ گیا تھا۔ جنگ میں دشمن کے ساتھ ایسا فیاضانہ سلوک ابوالحسن کی اعلیٰ ظرفی مروّت اور عفو و درگزر کا ثبوت ہے۔

"کاغذی برج" میں مغل فوجوں اور قطب شاہی لشکر کے درمیان ہونے والی گولکنڈے کی آخری لڑائی کا منظر بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ نصف النہار سے پہلے قلعہ فتح کر لیا جائے۔ جب توپیں سرد ہونے لگیں تو قطب شاہی جانبازوں نے بڑی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا لیکن شام تک لڑائی جاری رکھنے کے باوجود وہ اپنے برج کو بچا نہ سکے اور اسے مغل حملوں نے مسمار کر دیا۔ صبح جب مغل فوجیں بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ وہ برج جو کل منہدم کر دیا گیا تھا رات میں دوبارہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جب عالمگیر کا لشکر ایک غدار کی وجہ سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا تو انھیں یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ یہ برج لکڑی، کاغذ اور ٹاٹ سے تیار کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر زور کے افسانے "غیبی امداد" میں محاصرہ گولکنڈہ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے اہل اللہ کی کرامات اور باطنی تصرفات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مغلوں کو قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ کیے عرصہ گزر چکا تھا انھیں یقین تھا کہ سامان رسد کی فراہمی سے مجبور ہو کر ابوالحسن تاناشاہ کو دروازہ کھولنا پڑیگا لیکن خلاف امید ایسا نہیں ہوا مغل فوجیں قلعہ کی تسخیر سے قاصر رہیں۔ اورنگ زیب کو کبھی اتنے سخت حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ان کا شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ اس کے پیچھے کوئی باغی قوت اور غیبی

امداد کارفرما ہے۔ سرنگوں کے ذریعہ سے فصیلوں کو منہدم کرنے کی کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور خود ان کے مورچے تباہ ہونے لگے سیڑھیوں اور کمندوں کے ذریعے سے فصیلوں پر چڑھنے میں ناکامی یہ بتاتی تھی کہ کوئی غیبی طاقت قطب شاہوں کی حفاظت کر رہی ہے۔ اردوے معلیٰ کی یہ ناکامی باعث ندامت تھی۔ یکایک موسیٰ ندی میں طغیانی آگئی اور آندھی نے مغل سپاہیوں کے خیمے اور ان کے مورچے اڑا دیے۔ بہت سے مغل سپاہی موسیٰ ندی کے سیلاب کی نذر ہو گئے۔ ابوالحسن تاناشاہ کو یہ اطلاع ملی تو اس نے ہزاروں راس بیلوں پر غلّے کے بورے بار کرا کے اپنے ملازمین کے ہمراہ مغل فوجوں میں روانہ کیے۔ جب اورنگ زیب گشت پر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر دو سپاہی تلاوت قرآن میں مصروف ہیں اور انھیں دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا چراغ رکھا ہے جو آندھی اور طوفانوں میں بھی روشن ہے۔ قریب جا کر اورنگ زیب نے ان سے کہا آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ ہماری فوج میں موجود ہیں اس پر بھی فتح گولکنڈہ میں ایسی تاخیر تعجب خیز ہے اورنگ زیب کو انھوں نے ٹکا سا جواب دیا اور درشت لہجے میں گفتگو کی لیکن جب دیکھا کہ بادشاہ ٹلتا نہیں اور تلاوت میں خلل ہو رہا ہے تو انھوں نے ایک ٹھیکری لانے کو کہا اس پر کوئلے سے کچھ تحریر کر کے بادشاہ سے کہا لنگر حوض کے کنارے ایک چمار رہتا ہے اس کو دیجیے اور جواب لائیے۔ بادشاہ وہ ٹھیکری لے کر قلعہ داروں کی گولیوں سے بچتے ہوئے چمار تک پہنچا۔ اس نے غصّے سے بادشاہ کو دیکھا اور ٹھیکری کی دوسری طرف جواب میں کچھ لکھ دیا۔ جب اورنگ زیب ٹھیکری لے کر ان بزرگوں کے پاس پہنچے تو انھوں نے چمار کا جواب سنا دیا کہ قلعہ گولکنڈہ فتح ہونا مشکل ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس کی حفاظت کر رہی ہیں۔ اورنگ زیب نے ان سے دوبارہ مدد طلب کی تو ان بزرگوں نے عاجز آ کر اسی ٹھیکری پر کچھ لکھ دیا اور چمار کو دینے کے لیے کہا۔ چمار تحریر دیکھ کر غصّے سے کانپنے لگا اور دامن جھٹک کر کھڑا

ہوگیا اور بادشاہ سے کہا ان سے کہہ دو میں جارہا ہوں بمشیتِ ایزدی یہی تھی۔ یہ دونوں بزرگ یوسف صاحب اور شریف صاحب تھے جن کی درگاہ حیدر آباد کے محلّے نامپلی میں مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ چار قلعے کی حفاظت اور غیبی امداد کرنے والی ہستی تھی وہ دراصل گولکنڈے کے قطب تھے اور بظاہر چار کی طرح جوتے سی کر گذر اوقات کیا کرتے تھے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے دلچسپ قصّے سنا کر ڈاکٹر زور نے ایک گزرے ہوئے عہد کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے۔

"آخری سرفروش" بھی سیر گولکنڈہ کے دوسرے افسانوں کی طرح قطب شاہی عہد ہی سے متعلق ہے۔ یہ ان پانچ سو حبشی عورتوں اور مردوں کی داستانِ وفا ہے جنھوں نے گولکنڈے کے بادشاہ کی حفاظت کی خاطر اپنے بچوں کے ساتھ بالاحصار کے صدر دروازے کے قریب تاناشاہ پر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ جب مغل فوجیں فتح کے نشے سے چور دروازے کی راہ سے بالاحصار پہنچ گئیں تو ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں بھی جانبازوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ سردار کے حکم پر جب حبشی سپاہیوں نے نامہ باندھا تو مغلوں کی ایک صف خالی ہوگئی۔ ایک مغل سپاہی نے آواز دی کہ قلعہ ارا قبضہ ہو چکا ہے اب مزاحمت کیسی ہمیں بالاحصار تک پہنچنے دو۔ اس پر حبشی سردار اب دیا کہ ظل اللہ کا اجازت نامہ جس کے پاس ہوتا ہے ہم اس سے تعرض نہیں کرتے جوں اور حبشیوں میں بڑی دیر تک جنگ جاری رہی اور کئی حبشی مغلوں کے نشانہ بن گئے۔ مرنے والوں میں حبشی عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی جنھیں اپنی انعام مل چکا تھا اور گولکنڈے کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حرفوں میں جب ابوالحسن کو یہ معلوم ہوا تو وہ بالاحصار کے بھروکے میں برآمد ہوئے حکم دیں کہ وہ مغل سپاہیوں کو نہ روکیں۔ لیکن اب وقت گزر چکا تھا اور توں اور بچوں کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ آخری قطب شاہی بادشاہ کی

آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے مغل سپاہیوں نے ان سرفروشوں کی لاشوں سے اس کنوئیں کو بھر دیا جو دروازے کے سامنے تھا اور اس طرح بالاحصار تک پہنچنے کا راستہ نکال لیا۔

"خاصے کا وقت" بھی ڈاکٹر زور کا ایک پُر اثر افسانہ ہے۔ اس افسانے میں فتح گولکنڈہ کے بعد کے واقعات بڑے موثر اور ڈرامائی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:۔

"ان کی فطری ہمت ان کا بلند پایہ وقار اور تحمل اور ان کا شیوۂ تسلیم و رضا دنیا میں ہمیشہ آفت زدہ اور غم دیدہ انسانوں کے لیے درس عبرت بنا رہے گا۔ تاناشاہ اور ان کے آخری رفیقوں نے اسیری میں قلندری کی ایک ایسی مثال پیش کر دی ہے کہ دنیا کی تاریخ شاید ہی اس کا جواب دکھا سکے۔"

ابوالحسن کا مغل شہزادے کو خاصہ تناول کرنے کی دعوت دینا، زخموں سے چور عبدالرزاق لاری کا نگینہ باغ میں پہنچایا جانا اور مغل شہزادے اور تاناشاہ کا لاری سے ملاقات کو جانا یہ سب چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جنھیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ایک پلاٹ میں منسلک کر دیا گیا ہے۔ ان سے تاناشاہ کے کردار اور سیرت کا ایک ان مٹ نقش پڑھنے والے کے دل پر قائم ہو جاتا ہے۔

"مٹی کی کلہیا" سیر گولکنڈہ کا آخری افسانہ ہے اور تاریخ گولکنڈہ کے لحاظ سے بھی تاناشاہ کے اورنگ زیب کے ساتھ روانہ ہونے پر سقوط گولکنڈہ کے واقعات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ "سیر گولکنڈہ" کا سب سے زیادہ متاثر کن افسانہ ہے۔ ڈاکٹر زور کو قطب شاہی سلاطین اور قطب شاہی کلچر سے جذباتی لگاؤ تھا جس نے اس افسانے کے ایک ایک جملے کو پُر اثر بنا دیا ہے ابوالحسن تاناشاہ کی رخصت کا یہ منظر ملاحظہ ہو:۔

"سوار ہونے سے قبل بادشاہ نے اپنے امراء کا آخری سلام لیا۔ لیکن اسی معمولی

انداز میں بادشاہ کا رعب داب ایسا تھا کہ امراء بھی اپنے جذبات ضبط کیے ہوئے تھے جب تک بادشاہ ان کی طرف متوجہ رہے ان کی زبان سے اُف تک نہ نکلا، لیکن ان کے متغیر چہرے بتا رہے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک تلاطم سمندر پوشیدہ ہے اتفاق کی بات تھی یا نہ معلوم جان بوجھ کر بادشاہ نے فصیلوں کے اوپر محل کے جھروکوں کی طرف نظر نہیں اٹھائی ورنہ وہ محل کی پردہ نشینوں کو پریشان حال اور بیتاب دیکھ کر متاثر ہوتے۔ وہ سب دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھی ہوئی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہو۔ ۔ ۔ ۔

جب بادشاہ کا گھوڑا نظر سے اوجھل ہوگیا اور دنیا ان کے لیے تیرہ و تار ہوگئی تو انھوں نے فلک شگاف نالوں اور آہ و شیون سے بالاحصار اور محلات شاہی کو سر پر اٹھا لینا چاہا لیکن انھوں نے سوچا کہ دم کے دم میں مغل سپاہی محل کے اندر گھس آئیں گے اور پھر نہ معلوم ہمارا کیا حشر ہو انھوں نے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک ساتھ اس عظیم الشان حوض نما بادلی میں گرنے لگیں، جو انھیں جھروکوں کے پیچھے محل کے صحن میں اب تک موجود ہے۔"

اورنگ زیب نے تاناشاہ اور اس کے بیٹے خدابندہ کو (جسے اس نے "بندہ سلطان" کا خطاب دیا تھا) فوجوں کی نگرانی میں دولت آباد روانہ کر دیا تھا۔ بادشاہ کی آخری سواری شہر سے گزر رہی تھی۔ جب میانہ حسین ساگر کے قریب پہنچا تو خدابندہ نے اپنے والد تاناشاہ سے پانی مانگا۔ دوسری مرتبہ شہزادے کے پانی طلب کرنے پر تاناشاہ نے ایک سقے سے جو سڑک کا گرد و غبار روکنے کے لیے چھڑکاؤ کر رہا تھا پانی مانگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک مٹی کی کلہیا میں پانی بھر کر پیش کر دیا۔ خدابندہ نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ جواہرات کے مرصع چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے والا شہزادہ مٹی کی کلہیا سے پانی پی رہا تھا۔ جب خدابندہ نے پانی پی لیا تو تاناشاہ نے اپنی بیش قیمت انگوٹھی

اس میں ڈال دی اور سقہ کلہیا میں روشنی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جب اورنگ زیب کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے سقہ کو دو سو روپے دے کر ہزاروں روپیہ مالیت کی ہیرے کی انگوٹھی منگوا لی۔ "سیر گولکنڈہ" کے ان افسانوں کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ سلطنت قطب شاہی کے حکمرانوں کی سیرت کے روشن پہلو اور ان کے بلند کردار کو ظاہر کرنے والے واقعات افسانوں کی شکل میں پیش کر کے تاریخ کے اوراق پارینہ کو یکجا کر دیں۔ دیباچے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"اس مجموعے میں گولکنڈہ کی عظمت کو وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ایک حد تک بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سرزمین کے قطب شاہی حکمرانوں کی ان لازوال خدمات کی جھلکیں دکھائی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کی تاریخ، ادبی تمدنی معاشرتی اور عمرانی نقطۂ نظر سے دنیا کی بہتر سے بہتر اور ترقی یافتہ ممالک کی تاریخوں کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکے۔"

بارہ السانوں کے بعد "گولکنڈہ کے تاریخی آثار کی موجودہ حالت" کے زیر عنوان ایک مضمون بھی کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ گویا قلعہ گولکنڈہ کی ایک مفید اور دلچسپ گائیڈ ہے جس میں قلعہ کے اندر کی تمام عمارتوں اور تاریخی آثار کے متعلق معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ نگینہ باغ، بالاحصار، تہہ خانے، حماموں اور نقارخانوں وغیرہ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ قطب شاہیوں کی پوری تاریخ نظر کے سامنے روشن ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد قطب شاہی خاندان کا شجرہ بھی درج کیا گیا ہے۔

"سیر گولکنڈہ" میں ڈاکٹر زور کا اسلوب شگفتہ، دلکش اور سادہ ہے۔ کہیں کہیں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں بھی موجود ہیں "مشک محل" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"انھیں بنیادوں کے قریب ندی کے اس پار ایک نیا قافلہ خیمہ زن ہے جس کے

اردگرد بیسیوں اونٹ نظر آرہے ہیں۔ صبح کا سہانا وقت ہے آفتاب کی کرنیں ابھی ابھی بالاحصار کی بالائی چوٹیوں پر چمکنی شروع ہوتی ہیں گولکنڈے کی فصیلوں کی طرف سے چند سوار موسیٰ ندی کے کنارے آہستہ خرام موجوں کی طرح بڑھتے نظر آرہے ہیں اور ان کا رُخ ندی کے پار اس زیرِ تعمیر محل کی جانب پلٹا ہوا نظر آتا ہے وہ ابھی ندی تک پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ ان کے سردار کی نظر ان اونٹوں اور ان کے درمیان کے خیموں پر پڑ جاتی ہے اور خود اس کے گھوڑے کی رفتار کم ہو جاتی ہے وہ قریب کے ایک سوار سے پلٹ کر پوچھتا ہے"۔

ان افسانوں کے پلاٹ سادہ اور دلکش ہیں۔ ان میں نہ عروج (climax) کا کوئی خاص اہتمام ہے اور نہ ڈرامائی مکالموں کا التزام۔ فنی اعتبار سے ان افسانوں میں نقادوں کو شاید سقم نظر آئے لیکن ڈاکٹر زور کے افسانوں میں "کہانی پن" اور دلچسپی کی کمی نہیں۔ ڈاکٹر زور کے افسانے قاری کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر اسے تھوڑی دیر کے لیے مسحور کر دیتے ہیں اور ان کہانیوں کو ہم ایک بار شروع کر دیں تو ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی میں ڈاکٹر زور کے افسانوں کی شہرت و مقبولیت کا راز مضمر ہے "گولکنڈے کے ہیرے" پڑھ کر وہ لوگ جو ان تاریخی عمارات وغیرہ کی سیر کر چکے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے سرسری طور پر اور تفریحی انداز میں ان مقامات کی سیر کی ہے اور جنھیں گولکنڈہ دیکھنے کا شوق نہیں ہوا ہے۔ ان کے دل میں ان آثارِ قدیمہ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ رسالہ "اُردو" میں مولوی عبدالحق نے اس تصنیف کی افادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا،

"یہ تو بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی

دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے اس میں اس زمانے کے بادشاہوں شعراء اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے"۔

ننھی سانولی" ڈاکٹر زور کا بڑا رومانی اور دلکش افسانہ ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قحط میں جب غریب رعایا اس درجہ تباہ ہو گئی تھی کہ اپنی عزیز اولاد تک کو فروخت کر رہی تھی تو ملکہ نے لڑکیوں کو منھ مانگی قیمت دے کر خرید لیا تھا اور ان کی پرورش کی تھی، ان ہی لڑکیوں میں سے ایک غریب لڑکی اپنے شائستہ اطوار شگفتگی طبع اور حسن ملیح کی وجہ سے ملکہ کی ایسی منظورِ نظر بن گئی کہ مغلانیوں کی نگرانی سے نکل کر خانہ باغ میں ملکہ کی پیشی میں آگئی۔ اور ملکہ نے امیرزادیوں کے زمرے میں اسے شامل کر لیا۔ رنگ روپ اور وضع قطع کے اعتبار سے اس کو ننھی سانولی کا خطاب بھی عنایت کیا گیا تھا۔ خانہ باغ کی سہیلیاں اس سے کھنچی کھنچی رہتیں کیونکہ وہ ایک غریب انسان کی بیٹی تھی ننھی سانولی کو اپنے غریب ماں باپ پر افسوس ہوتا۔ ایک روز سہیلیوں نے اسے بہت چھیڑا اور پانی کی بوچھار سے اسے پریشان کر دیا تو اس سے بچنے کے لیے ننھی سانولی بھاگنے لگی اور ایک حوض میں گر پڑی۔ دوسرے محل کے کوٹھے پر شہزادہ پتنگ اڑا رہا تھا اس نے ننھی سانولی کو دیکھا اور دیوار پھاند کر مہ جبینوں کے جھرمٹ سے گذرتا ہوا اس تک پہنچ گیا اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ لیکن کہاں لے جائے۔ ملکہ کا خوف دل پر ایسا طاری ہوا کہ دیوار پھاند کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے چہیتے بھتیجے شہزادے سلطان مرزا کی پرورش و تربیت خاص شاہی محل میں اپنی ذاتی نگرانی میں کی تھی کیونکہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا اور خوش بخت شہزادہ اس کا جانشین قرار دیا گیا تھا اور اسی سے ان کی اکلوتی بیٹی

حیات بخشی بیگم منسوب تھیں۔ شہزادہ حیات بخشی بیگم سے شادی نہ کرنے کی بات ننھی سانولی سے کہتا ہے۔ کوٹھے پر دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخر شہزادہ خادمہ سے خط بھیجتا ہے کہ قلعہ میں بادشاہ کی سالگرہ کے دن وہ بالاخانے پر آئے اور دونوں بیجاپور کو ہجرت کر جائیں گے۔ جواب میں ننھی سانولی نے لکھا کہ وہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں اس محبت کی یادگار میں ایک محل تعمیر کروائے جس کا نام گوشہ محل ہو اور محلات کی شریف لڑکیاں اور شہزادیاں اس محل میں پرورش پائیں۔ پردے میں زندگی کی ہر نعمت سے لطف اندوز ہو سکیں اور ان کی بے پردگی کی وجہ سے شہزادوں کو عشق و محبت کے جال میں پھنس کر سلطنت سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔ شہزادہ خط پڑھ ہی رہا تھا کہ یکایک محل سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ "ننھی سانولی" پانی سے کھیلتے کھیلتے شش منزلہ محل سے نیچے کود پڑی ہے۔ شہزادہ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ننھی سانولی کی لاش خاک و خون میں غلطاں ہے۔ جب محمد قطب شاہ نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا تو اس کے بعد ہی "گوشہ محل" کی مشہور عمارت کی بھی بنیاد ڈالی جس میں بالاحصار سے زمین دوز راستے کے ذریعہ اہل محلات کی آمد و رفت ہوتی تھی اس کا حوض اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ پردہ نشینان محل پردے میں رہ کر تیراکی اور کشتی رانی کی مشق کر سکیں۔

ڈاکٹر زور نے "پارخ اشرفیاں" میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح حیدرآباد کے عوام اور غریب طبقے کے افراد نے عبداللہ قطب شاہ کی جان بچائی تھی۔ اورنگ زیب کا لشکر حسین ساگر تک پہنچ چکا تھا اور دھوکے سے اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے اہل شہر نے بادشاہ کو بچانے کے لیے گھمسان کی لڑائی کی۔ عبداللہ قطب شاہ دولت خانہ عالی میں پہنچ کر سرنگ کے ذریعے سے قلعہ گولکنڈہ میں بحفاظت داخل ہو گیا۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عوام اور گولکنڈے کے حکمرانوں میں کیسی محبت تھی۔ بادشاہ عوام کا خیر خواہ

تھا اور عوام بادشاہ کے لیے لڑنے مرنے کو تیار تھے۔

"کوہ نور" (۱۰۶۶ھ) بھی ڈاکٹر زور کا ایک کامیاب افسانہ ہے اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ محمد سعید، اردستان کے ایک تیلی کا بیٹا تھا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں ایک ایرانی جوہری کے معمولی ملازم کی حیثیت سے گولکنڈہ آیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں میر جملہ اور امیر الملک جیسے رفیع الشان خطابات اور سپہ سالاری اور صدر اعظمی کی جلیل المرتبت خدمات پر فائز ہوا۔ اورنگ زیب سے مل کر حیدرآباد میں تباہی مچائی۔ اس نے بادشاہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو ناکام ہو گیا۔ لیکن حیدرآباد میں قتل و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ "شعلۂ انتقام" "سرو صحرا" اور "بالا" قطب شاہی تمدن کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔

"چچلم کی رقاصہ" میں بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق کو موضوع بنایا گیا ہے جب بادشاہ کو اس معاشقے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ شہزادے کو بالاحصار کے ایک پرفضا محل میں قید کر دیتا ہے۔ عرب ایران آرمینا ترکی گجرات اور تلنگانہ کی حسین لڑکیاں بڑے اہتمام کے ساتھ محل میں جمع کر دی جاتی ہیں اور بیس منتخب مہ جبینوں میں سے ہر ایک کو خود بادشاہ نے بہ نفس نفیس سمجھا دیا کہ جو کوئی نوجوان ولیعہد کو اپنی طرف مائل کرے گی اور چچلم کی رقاصہ کا خیال اس کے دل سے نکال دے گی وہی اس عظیم سلطنت کی ملکہ قرار دی جائے گی اور اسی کی نسل سرزمین دکن کو سیاہ و سفید کی مالک رہے گی لیکن کوئی نازنین شہزادے کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔ ایک دن طوفانی بارش شروع ہو گئی تو شہزادے نے بالاخانے پر چڑھ کر دیکھا کہ موضع چچلم میں ایک چراغ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو تمام گاؤں نذر سیلاب ہو گیا ہے یا طغیانی کے خوف سے بستی والے گھر بار چھوڑ کر اطراف و اکناف کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں چچلم بھاگ متی کے لیے تشویش کا محل تھا۔ شہزادہ نظر بچا کر بالاحصار سے باہر آیا اور ایک ہاتھی

پر سوار ہو کر ندی کی طرف بڑھنے لگا۔ صدر محافظ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گیا۔ ہاتھی نے ندی میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا تو محمد قلی قطب شاہ دوڑ کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایڑ لگائی تو گھوڑا کشتی کی طرح پانی میں تیرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ شہزادے نے دیکھا کہ چچلم کی طرف بیرونی آبادی تہہ آب ہوئی ہے اور اندرون موضع کی آبادی پانی کی زد سے محفوظ ہے۔ وہ ایک آن میں بھاگ متی کے قریب پہنچ گیا۔ بھاگ متی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر اپنے عاشق کے انتظار میں دروازے پر کھڑی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"سلطان ابراہیم قطب شاہ کو شہزادے کی اس خطرناک جرأت کی اس وقت خبر ہوئی جب کہ شہزادہ خطرہ سے باہر ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس واقعے کے دوسرے دن ندی پر پل بنانے کا حکم دیا جو موسیٰ ندی کا پل تھا اور آج حیدرآباد کے باشندے اس کو پرانا پل کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر زور کے ان افسانوں کی نوعیت نیم تاریخی اور نیم افسانوی ہے۔ ان کے بہت سے کردار تاریخی پس منظر میں ابھرتے ہیں لیکن ایک دو کردار ایسے بھی ہیں کہ اگر ہم انھیں تاریخ کی روشنی میں لا کر کھڑا کریں تو وہ فضاؤں میں تحلیل ہو جائیں گے کیونکہ یہ شاعرانہ تخیل کی پیداوار اور افسانوی دنیا کی مخلوق ہیں۔ "چچلم کی رقاصہ" میں ڈاکٹر زور نے بھاگ متی کو اس کہانی کا مرکزی کردار بناتے ہوئے اسی کے گرد افسانے کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ گولکنڈے کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ نے جو اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی تھا اپنے کلیات میں بارہ پیاریوں اور دوسری منظور نظر محبوباؤں کے سراپے پیش کیے ہیں اور ان کے حسن و جمال کو سراہا ہے لیکن بھاگ متی کا نام کلیات کے اوراق میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ہمعصر تاریخوں سے ڈاکٹر زور کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔[1]

[1] رافعۃ الحروف نے اپنے مضمون "بھاگ متی اور اس کا نو دریافت مقبرہ" مطبوعہ آجکل دہلی (باقی اگلا صفحہ)

"سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" کا مطالعہ کریں تو کہیں کہیں ڈاکٹر زور کے بیانات میں تضاد بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر زور اپنے افسانے "کوہِ نور" میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ اس خفیہ راستے سے جو دادمحل سے گولکنڈے کے بالاحصار تک شہر اور ندی کے نیچے سرنگ کھود کر بنایا گیا تھا قلعہ میں پہنچ گئے تھے۔ اور یہ کہ اس "بھنیارے" کے نشان اب تک چوک کی مسجد کے قریب جہاں دادمحل واقع تھا موجود ہیں لیکن "پانچ اشرفیاں" میں لکھتے ہیں:

"دغاباز میر جملہ کا یہ جواب ملکہ کو اس وقت ملا جب اورنگ زیب حسین ساگر کے کنارے تک پہنچ چکا تھا اور سلطان عبداللہ دھوکے میں آکر اس کے استقبال کے لیے نکلا تھا۔ جب راستے میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مغل سوار اس کو قید کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں تو وہ فوراً محل کی طرف پلٹا لیکن اس اثنا میں مغل اس کے قریب پہنچ چکے تھے ..... اس اثنا میں بادشاہ صحیح سالم دولت خانہ عالی میں پہنچ کر سرنگ کے ذریعے سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہو گیا"

ڈاکٹر زور نے "فرخندہ بنیاد حیدرآباد" میں دولت خانہ عالی اور دادمحل کو دو مختلف عمارتیں بتایا ہے اور لکھتے ہیں:۔

"دولت خانۂ عالی کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ محمد قلی نے ایک دادمحل بھی بنایا تھا جو انہی محلات کی پشت پر یعنی مغرب اور جنوب کی طرف بنایا گیا ہے۔"

ان چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں سے قطع نظر "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" قطب شاہی عہد کی تاریخ و معاشرت اور ثقافتی رجحانات کی موثر عکاسی کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے اکثر کردار ایسے ہیں جن پر تاریخی شواہد کی مہر ثبت کی جا سکتی ہے لیکن

(بقیہ گزشتہ) ۱۹۸۰ء میں اس سے مفصل بحث کی ہے۔ رافعۃ الحروف نے محمد قلی قطب شاہ کا جو کلیات مرتب کیا ہے اس کے مقدمے میں بھی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

افسانہ نگار نے "زیب داستاں" کے لیے ان میں اپنے تخیل کی مدد سے بہت سے خوبصورت اضافے بھی کیے ہیں۔ ان تمام افسانوں کا مقصد "تاریخ گولکنڈہ کے روشن کرداروں کو ہمیشہ کے لیے ادب کے نگارخانے میں محفوظ کر دینا ہے۔ ان سب کا موضوع مشترک ہے یعنی قطب شاہی تہذیب و ثقافت کی عکاسی اور عظمتِ رفتہ کی داستانِ پارینہ کو امدادِ زمانہ کے ہاتھوں مٹنے سے بچا لینا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے ان بھولی بسری کہانیوں کو ادب کا جزو بنا کر تاریخ و ثقافت کی بھی ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ اگر ڈاکٹر زورؔ یہ کہانیاں نہ لکھتے تو ان کے بعد کی نسلیں تاریخِ گولکنڈہ کے ان درخشاں کرداروں سے کبھی متعارف نہیں ہو سکتی تھیں۔ اب ایسے تاریخی شغف اور ثقافتی شعور رکھنے والے قطب شاہی تمدن کے مداح و شیدا ادیب کہاں جو ایسے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ وہ کہانیاں ہمیں سنا سکیں جو "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" ہو چکی ہیں "گولکنڈے کے ہیرے" اور "سیرِ گولکنڈہ" پڑھ کر ہمارے دل قطب شاہیوں کے احترام اور ان کی محبت سے سرشار ہو جاتے ہیں اور زوالِ گولکنڈہ کی داستانیں پڑھ کر ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں کیا یہ مصنف کے زورِ قلم اور طرزِ تحریر کی اثر آفرینی کا ایک اچھا ثبوت نہیں ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانے فنی اعتبار سے انشائیہ اور افسانے کا ملا جلا روپ ہیں۔

شاعری

ڈاکٹر زورؔ نے بچپن ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ اس زمانے میں حیدرآباد شعر و سخن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، ماہر القادری، علی اختر، امجد حیدرآبادی، صفی، نظام شاہ لبیب، صدق جائسی اور رفائی بدایونی یہاں موجود تھے اور کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ دکن کی ادبی محفلیں ان نامور شعراء کے نغموں سے گونج رہی تھیں۔ اس ماحول میں ڈاکٹر زورؔ کا شاعر بن جانا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا تھا کہ ان کا کلام اتنا وافر تھا کہ وہ چاہتے تو ایک مجموعہ شائع ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے دوسرے کاموں کی طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے سرمایۂ سخن سے اتنی بے اعتنائی برتی کہ اس کا ایک بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ جب ڈاکٹر زورؔ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا چسکا لگا اور یورپ سے واپسی کے بعد وہ درس و تدریس کے مشاغل میں منہمک ہو گئے اور تحقیق کو اپنی جولانگاہ بنایا تو شاعری کا ذوق مضمحل ہونے لگا۔ ان کے استاد وحید الدین سلیمؔ ہمیشہ اُردو کی جدید ضرورتوں کی طرف انھیں متوجہ کرتے رہتے تھے اس لیے بھی انھوں نے عام راستے سے ہٹ کر نئے نئے کام کرنے اور مادرِ جامعہ کا نام روشن کرنے کے لیے شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تاریخ اور تحقیق و تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی۔ شاعری میں تجربات کی اہمیت پر انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں روشنی ڈالی ہے۔ قدیم شاعری

اور ترقی پسند شاعری دونوں ان کی نظر میں وقت کے تقاضے تھے اور انھوں نے عیاذ انصاری سے کہا تھا:

"اپنے خاندانی یا موروثی مزاج کے مطابق دونوں میں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ رواداری اور رمنجاں مرنج طرزِ زندگی میرے حصے میں آئی ہے۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پیرس میں دو سال بہت اعلیٰ پایے کے کمیونسٹ احباب کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کا شمار میرے مخصوص دوستوں میں ہے۔ میں کام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ نہیں دیکھتا کہ کس گروہ یا کس مذہب اور مسلک کے ادیب و شاعر کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر ہے۔"

کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جب انھوں نے ڈاکٹر زورؔ سے یہ دریافت کیا کہ وہ شعر کیوں نہیں کہتے تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ زبان کی خدمت شاعری کے علاوہ اور بھی طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے شاعری ترک کردی تھی لیکن اپنے تخلص ہی سے مشہور تھے اس لیے حیدرآباد میں بعض لوگ ان کے تخلص پر پھبتیاں کستے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے بہت کم کہا لیکن بہتوں سے اچھا کہا ان کے کلام میں جو شائستگی اور لطافت ملتی ہے اس میں ان کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ سوقیت سے دامن کشاں رہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی ابتدائی شاعری ان کے ایامِ شباب کی یادگار ہے ان کے مزاج میں جو نفاست اور شخصیت میں جو رکھ رکھاؤ تھا اس کی جھلک ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہے ایسے شعر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جن میں ابتذال یا تلذذ پسندی کا شائبہ بھی موجود ہو۔

شاعری ڈاکٹر زورؔ کو ورثے میں ملی تھی ان کے والد غلام محمد قادری شاعر تھے اور زعمؔ تخلص کرتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کی علم پرور فضاؤں نے ڈاکٹر زورؔ کے ذوقِ شعرگوئی

کو جلا بخشی تھی۔ حیدرآباد میں "جہان آباد کا آخری شاعر" داغؔ خاموش ہو چکا تھا اب یہاں کی ادبی فضا میں جدید شاعری کے ترانے گونج رہے تھے اور ترقی کی تمنا دکن کے متوسط طبقے کے دل میں بھی مچلنے لگی تھی اور اپنے وطن کی سرزمین کا عشق شعر و نغمے میں ڈھلنے لگا تھا۔ اپنی زبان و ثقافت کے تحفظ کا خیال اور اس پر فخر کرنے کا جذبہ نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ جامعہ عثمانیہ نے پہلی بار جامعاتی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کا تجربہ کیا تھا اور یہ ایک عہد آفریں کارنامہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی علمی و تہذیبی برتری کے خلاف ایک موثر عملی اقدام بھی تھا۔ دکن کے نوجوان اپنے مستقبل سے بڑے پر امید تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ "غیر ملکیوں" سے مسابقت میں انھیں اس نئی تعلیمی پالیسی سے بڑی مدد ملے گی۔ اس تناظر میں زور صاحب کی نظم "جامعہ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن" کہی گئی تھی جس میں "ہر ذرے" کے "آفتاب" بننے "عظمت ملک دکن" "منت کشی کے سدِ باب" اور "داغ ہائے منت اغیار" دھونے کا ذکر یہ بتلاتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ سے نئی نسل نے کیا کیا توقعات وابستہ کی تھیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کے ہر ذرے کو رشکِ آفتاب اب دیکھیے
عظمت ملک دکن کو بے نقاب اب دیکھیے
ہو چکا منت کشی کا سدِ باب اب دیکھیے
دیکھیے ہاں دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے

داغ ہائے منت اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ چمن شاداب ہوتے جائیں گے

کالج کے زمانے کی کہی ہوئی جو نظمیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک ابھرتے ہوئے شاعر اور ہونہار طالب علم کی ذہنیت کی عکاسی ملتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے شعر گوئی کے روایتی طرز کو اپنایا تھا اپنے اشعار میں وہ "شبِ مہتاب" "دیدہ گریاں"

"تغافل یار" اور "حسن ہوش ربا" کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں نوجوانی کی امنگ بھی ہے اور محبت کرنے کا حوصلہ بھی۔ ان میں انفرادی اور داخلی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ زبان میں روانی اور سلاست ہے لیکن گہرائی رفعت تخیل اور ندرت فکر کے عناصر نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹر زور کی ابتدائی نظمیں ہلکی پھلکی اور عشقیہ ہیں۔ یہ نظمیں عنفوان شباب کے لطیف اور معصوم جذبات کی آئینہ دار ہیں" افسانہ محبت" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہیں یاد ابھی وہ دن تھی تیری جبیں سادہ — عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بیگانہ
تھا دخل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی — انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نہ یارانہ
وہ راحت جاں بننا وہ روٹھ کے من جانا — وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرے پہ چمک جانا — وہ وقت خرام ان کے اعضا کا لچک جانا
مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی باتیں وہ — محبوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ

ٹیگور کے اثر سے اردو میں رومانیت اور ماورائیت کے ملے جلے جذبات کا نفوذ بڑھتا جا رہا تھا۔ حیدر آباد کے شعراء بھی اس سے بچ نہ سکے تھے۔ ڈاکٹر زور کی نظمیں "چاندنی" اور "رہبر منزل کی جدائی" یہاں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ "چاندنی" ان کے ابتدائی مشق سخن کی یادگار ہے اس کے باوجود اس میں ایک تازگی محسوس ہوتی ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پھر ذکر رونق شب مہتاب آگیا — سامان وحشت دل بیتاب آگیا
موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی — اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی
ہوگا یونہی فلک پہ صدا ماہ ضوفشاں — مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں

ڈاکٹر زور کی نظم "آسمان کی زبان" میں حفیظ جالندھری کے گیتوں کے تجربے سے استفادے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر زور کی شاعری کا دوسرا دور وادی کشمیر سے وابستہ ہے مسلسل کئی سال کی خاموشی کے بعد وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے تھے۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین کشمیر کے دلفریب نظاروں۔ یہاں کے پرفضا اور فرحت بخش ماحول اور اس جنت نشاں کی دلفریبیوں سے مسحور ہو کر ڈاکٹر زور نے شعر کہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کو بڑھاپے میں وطن چھوڑنا پڑا تھا ادارہ جس کی تعمیر میں ان کا خون جگر صرف ہوا تھا اور جو ان کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ حیدر آباد میں تھا، دوست احباب عزیز و اقارب اور افراد خاندان سب یہیں تھے ڈاکٹر زور کشمیر کیوں گئے؟ وہ مستقبل کے درخشاں منصوبوں کے ساتھ یہاں آئے تھے یا حالات نے انھیں ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جہاں سے انھوں نے اپنے لیے یہ راہ منتخب کی تھی؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اردو زبان کی خدمت کا جذبہ انھیں کشمیر لے گیا ہو یا کشمیر جانے کی کوئی اور وجہ رہی ہو۔ بہرحال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پردیس میں دکن کے دیوانے کو وطن کی یاد ستاتی رہی اور ان میں سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا۔ کشمیر میں انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ جذبات کی حرارت سے تابندہ اور شدت احساس سے منور ہیں۔ ڈاکٹر زور شاعری میں بھی شاید اپنا ایک مقام پیدا کر لیتے لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس چراغ کو گل کر دیا۔ آخری زمانۂ حیات میں ڈاکٹر زور کا شعر گوئی کی طرف مراجعت کرنا گویا کار جہاں تمام کر کے اپنی ذات کی طرف لوٹنے کا عمل تھا۔ تمام زندگی وہ علمی اور تحقیقی کام کرتے رہے اور جب انھوں نے شاعری شروع کی تو ساز ہستی ہمیشہ کے لیے "بے صدا" ہو گیا ڈاکٹر زور نے کشمیر پہنچ کر مسلسل شعر کہے تھے شاعری کا وہ سرچشمہ جو گویا خشک ہو چکا تھا وقت کے تیشے سے جوئے شیر بن گیا تھا۔ اگر ان کی شاعری رومان خیز فضاؤں کی پیداوار ہوتی تو وہ قیام یورپ ولندن کے زمانے میں جو جوانی اور ولولہ انگیزی کا عہد تھا نہ جانے کتنے شعر کہہ ڈالتے۔ جب ہم کشمیر میں ڈاکٹر زور کے کہے ہوئے اشعار کی

معنویت پر غور کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں جوش و خروش، زندہ دلی یا شگفتگی و سرشاری کے بجائے ایک میٹھی کسک کا احساس موجود ہے۔ ڈاکٹر زور کی یہ پوری غزل اسی احساس کی ترجمان ہے ؎

ہم اپنی گرمیِ سوزِ دروں سے چیخ اٹھے — خوشا کہ مستیِ فیضِ جنوں سے چیخ اٹھے
یہ نازِ طبعِ بلند و بزعمِ خود نگہی — زمانہ سازیِ دنیائے دوں سے چیخ اٹھے

ڈاکٹر زور کی ایک اور غزل ان کے شخصی تجربات و واردات کی غماز نظر آتی ہے ؎

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں — کبھی سحر کے کبھی شب کے انتظار میں ہیں
یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں — وہ سوئے دار چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید — فریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں
فیضِ سوزِ دروں اور بطرزِ اہلِ جنوں — وہی ہے منزلِ لیلےٰ کہ جس دیار میں ہیں

ڈاکٹر زور کی نظمیں "آگ بھڑکتی رہی" اور "جہانِ آشوب" کے اشعار میں وطن سے دوری اور انتظار و تشنگی کی چبھن موجود ہے۔ اپنی ایک غزل میں ان لوگوں پر چوٹ کی ہے جو "گل کے نظاروں" "چشموں" "رنگ و بو" اور "بہاروں" میں تفریحِ طبع کے سامان ڈھونڈتے ہیں "ہستی کی تلخیوں" کے گوارا نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کہتے ہیں ؎

فردوسِ آب و گل کے نظاروں کا شوق ہے — چشموں کا رنگ و بو کا بہاروں کا شوق ہے
انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر — دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے
ہستی کی تلخیاں جو گوارا نہ ہو سکیں — زندوں سے ہے نفور مزاروں کا شوق ہے

ڈاکٹر زور کوئی بلند پایہ شاعر نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت کبھی نہیں رہی اس کے باوجود ان کے کلام میں بعض ایسے شعر نکل آتے ہیں جو ہمیں متوجہ کر لیتے ہیں۔ چند شعر درجِ ذیل ہیں ؎

دل ہو بیدار تو انسان سمجھ سکتا ہے — قوتیں اور بھی ہیں دولت و ثروت کے سوا
ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پر لطف و حسیں — یہ نہ حاصل ہو تو بیکار ہے دنیا ہو کہ دیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے — ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریب
اپنی کوتاہیِ دانش کا گلہ کیا کیجے — بارہا ہم بھی گئے تھے درِ زنداں کے قریب

ڈاکٹر زور کی نظموں میں کسی مخصوص طرزِ فکر کی ترجمانی نہیں ہے، کبھی وہ زندگی کی لایعنیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کبھی جہدِ حیات میں انسان کے عزم و عمل کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ زندگی کی لایعنیت کے بارے میں کہتے ہیں ؎

کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید — فریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں

لیکن ڈاکٹر زور کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک باعمل اور حرکی شخصیت کے مالک تھے اور سعیِ مسلسل پر ایقان رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں ایسے اشعار نظر سے گذرتے ہیں جن میں زندہ رہنے کا حوصلہ اور جہدِ حیات میں نبرد آزما ہو کر اپنی انفرادیت منوانے کا جذبہ موجزن ہے ؎

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے — اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو
منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر — سب ہی اسباب ہونگے بہم ساتھیو

اس لیے ان کے کلام میں رجائیت کا احساس موجود ہے ؎

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی — زندہ دل ہنستے ہنستے گذر جائیں گے
موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم — زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے جب ڈاکٹر زور کی شہرت بامِ عروج پر پہنچی تو وہ شاعری سے اتنے دور ہو چکے تھے کہ اہلِ حیدرآباد ان کے سرحرفی تخلص کو ماضی کی یادگار تصور کرنے لگے تھے اور جب دوبارہ انھوں نے شاعری شروع کی تو موت کے سرد ہاتھوں نے ان نغموں کو ہمیشہ کے لیے منجمد کر دیا۔

متفرقات

ڈاکٹر زور کی ادبی دلچسپیاں گوناگوں تھیں اس لیے ان کی تصانیف کے موضوعات پر بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ انھوں نے تحقیق اور تنقید، ترتیب و تدوین، تذکرہ نویسی تاریخ، لسانیات، افسانہ نگاری اور شاعری جیسے رنگا رنگ ادبی میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے ادبی اکتسابات میں مضامین کی جیسی بوقلمونی ملتی ہے شاید ہی ان کے کسی ہمعصر کی تحریروں میں نظر آئے۔ ڈاکٹر زور نے فن انشا پردازی کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اردو کے اسالیب بیان کی تاریخ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ محمود غزنوی کی بزم ادب کی تصویر کشی بھی کی ہے اور جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلباء کے علمی کارناموں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر زور نے ادب کی مختلف اصناف اور مختلف النوع موضوعات کو اپنی جولانگاہ بنایا ہے۔

"اردو کے اسالیب بیان" ادبی تاریخ کی تدوین کا ایک نیا باب ہے۔ اس وقت تک اردو میں ادبی تاریخیں لکھی گئی تھیں ان میں سے کسی میں بھی زبان اور اسالیب بیان کی عہد بعہد ترقی کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی۔ "اردو کے اسالیب بیان" میں بقول ڈاکٹر زور "تہذیب و معاشرت کی تبدیلیاں اور ضروریات زمانہ کے اقتضا سے موقع بہ موقع جو تغیرات رونما ہوتے رہے ہیں اور اردو کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی زبان اور اسلوب کو متاثر کرتے رہے ہیں" ان کا "تنقیدی تذکرہ" ہر دور کی نثر کے

نمایندہ انتخاب کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسے علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ضخیم نہیں مصنف نے دس باب میں اسے تقسیم کر کے اردو ادب کی مختلف تحریکات اور اردو کے مراکز میں نثر کی نشو و نما اور ترقی کے مختلف مدارج کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ پہلے باب میں زبان کی ابتداء اور اس کے ابتدائی نمونوں پر تبصرہ کیا گیا ہے دوسرے باب میں دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں اردو ادب کی نشو و نما سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل سے متعلق ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے اہم مصنفین کی تصانیف اور ترجموں کا مفصل حال قلمبند کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح جان گل کرسٹ اور ان کے رفقاء نے اپنی اس تحریک کے ذریعے سے اردو نثر کا ایک نیا باب وا کر دیا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے اردو نثر میں جو سلاست روانی، بے ساختگی اور فطری انداز پیدا کیا اس کی نشان دہی کرتے ہوئے کالج سے وابستہ مصنفین کے طرز تحریر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹے باب میں خود زور اس کے قریبی زمانے میں جس انداز کی نثر لکھی جا رہی تھی اس پر تبصرہ کیا گیا ہے اور مقفیٰ و مسجع اور سادہ نثر کے نمونے پیش کیے گئے ہیں تاکہ ان کا فرق نمایاں ہو سکے۔ سرسید کی ابتدائی مساعی کی تفصیل درج کرنے کے لیے ایک علیحدہ باب موجود ہے اور اس میں حالی، محسن الملک، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ اور شبلی وغیرہ کی نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کی عبارتوں کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "موجودہ انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب" کے زیر عنوان عبدالحلیم شرر، محمد ہادی رسوا، حسن نظامی، راشد الخیری اور سرشار کی ادبی تخلیقات کے اسالیب اور ان کے مخصوص طرز تحریر پر تبصرہ کیا گیا ہے مہدی افادی اور ان کے بعض ہمعصر مصنفین کی نگارشات پر انگریزی ادب کے اثر پذیری کی جو چھاپ ہے اس کا

تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کی عبارتوں کی ندرت اور طرز انشا پردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے نثر نگاروں کے اسالیب پر بعض بڑی خیال انگیز تنقیدیں کی ہیں اس سے ان کی اصابت رائے اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ حسن نظامی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"حسن نظامی کے لطیف چھوٹے چھوٹے جملے عربی، فارسی اور ہندی کے دلچسپ اور پُر ترنم الفاظ کا انتخاب سادی سیدھی مگر ساتھ ہی بانکی عبارتوں میں بڑے مطالب کو حل کرنا۔ بے تکلفی اور بے ساختہ پن یہ تمام چیزیں ان کے نام کو اس وقت تک زندہ رکھیں گی جب تک اردو نثر باقی رہے گی۔"

کئی سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ڈاکٹر زور کی اس رائے سے اختلاف کا کوئی پہلو نہیں نکل سکا ہے۔ اس باب میں ابو الکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، علامہ عبداللہ عمادی، تاجور نجیب آبادی، نظم طباطبائی، اسلم جیراجپوری، مولوی عبدالحق اور وحیدالدین سلیم کی تحریروں پر تنقیدی نظر ڈال کر ان کے اسالیب کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "اردو نثر کے رجحانات" اس کتاب کا آٹھواں باب ہے جو اس اعتبار سے اہم ہے کہ مصنف نے مرصع نگاری، نثر کی اقسام، نثر مرجز، مقفیٰ، مسجع اور عاری کی نئی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے نمونے پیش کیے ہیں۔ سادہ نگاری، محاورہ، الہلالی اردو، انگریزیت، ادب لطیف اور گلابی اردو کی ماہیت کی توضیح کرتے ہوئے مختلف ادیبوں کی کتابوں سے اس کی مثالیں تحریر کی گئی ہیں اور سب سے آخر میں "اردو نثر کا مستقبل" کی سُرخی قائم کر کے مصنف نے مفید مشوروں سے قارئین اور ادیبوں کی رہبری کی ہے۔ "اردو کے اسالیب بیان" اپنے موضوع کی ندرت کے اعتبار سے ڈاکٹر زور کی تصانیف میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

"فن انشا پردازی" اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں بقول مصنف انشا پردازی اور "تصنیف و تالیف میں کامیابی حاصل کرنے کے اصول" زیر بحث آئے ہیں۔ دیباچہ میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"یہ چھوٹی سی کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق نشو و نما پائے اور وہ انشا پردازی اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے اپنی زبان کی سچی خدمت کرنے اور اس سے لطف اندوز اور متمتع ہونے میں کامیاب ہو سکیں"

ڈاکٹر زور نے قیام یورپ کے زمانے میں انشا پردازی اور تصنیف و تالیف کے اصولوں سے متعلق بہت سی انگریزی اور فرانسیسی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کیا تھا اس موضوع پر انھوں نے رسالہ "ہمجولی" مجلہ عثمانیہ" "تحفہ" اور سالنامہ "رہبر دکن" میں مضامین بھی شائع کروائے تھے۔ اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کیا تھا جن میں "آن دی آرٹ آف رائٹنگ (On the Art of Writing) مصنفہ سر آرتھر کولرج، "دی جنٹل آرٹ آف آتھرشپ" (The Gentle Art of Authorship) مصنفہ سی، ای لارنس، کونسائی سیر لارٹ دیکریر" مصنفہ گستا ولانسون اور "لائف اینڈ لٹریچر Life and Literature) مصنفہ لفکاڈیو ہیرن سے بھی استفادہ کیا تھا۔ "فن انشا پردازی" میں اکیس عنوانات موجود ہیں ایک سو پندرہ صفحے کی یہ کتاب زیادہ ضخیم نہ ہونے کے باوجود مفید اور کارآمد معلومات سے پُر ہے اور ڈاکٹر زور نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کیوں لکھیں" "کیا لکھیں" "کس طرح لکھیں" اور "لیاقت لکھیں" وغیرہ اس کتاب کی اہم سرخیاں ہیں جن کے تحت تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کے بہت سے امور منکشف ہوئے ہیں۔ "اسلوب بیان" "اپج پیدا کرنا"

"فن اجمال" "ظرافت نگاری" "موقتی مضامین اور افسانے" "بچوں کے لیے لکھنا" اور "اپنے کام پر تنقید" ایسے عنوانات ہیں جن کی طرف اس وقت تک اہل قلم نے زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر زور نے فن انشا پردازی میں، انشا پردازی کے اصول کرنے اور اس فن کے اہم نکات سے واقف کروانے کی کوشش کی ہے۔

یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد حیدر آباد کی ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ ریاست حیدر آباد میں پیشکار، مدار المہام اور صدر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے جو شہرت و نیک نامی حاصل کی اور طبقہ امراء اور عوام نے ان سے جو بے پناہ محبت کی اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ حیدر آباد کا ہر فرد ان کی داد و دہش، علم پروری، اخلاق و سیرت اور وسیع النظری کا دل سے مداح تھا۔ شاد ایک خوش گو شاعر اور انشا پرداز بھی تھے۔ ان کی ساٹھ سے زاید تصانیف طبع ہو چکی ہیں جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ وہ ایک سچے محبِ وطن اور خاندانی امارت کے باوجود صوفی منش انسان تھے۔ حیدر آباد کے معروف شاعر سکندر علی وجد نے انھیں خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے "پرستار وطن صوفی اور رنگ نشیں" کہا تھا۔ اقبال اور شاد کے درمیان تیس سال سے زیادہ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ ڈاکٹر زور نے ان خطوط کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ خطوط کی تعداد ایک سو ایک ہے اور یہ اکتوبر ۱۹۱۶ء سے جنوری ۱۹۲۷ء کے طویل عرصے پر محیط ہیں لیکن درمیان میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے خطوط موجود نہیں ہیں۔ اقبال کے ان خطوط سے ان کی زندگی اور سیرت کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل نہیں ہوتیں اس لحاظ سے یہ خطوط اس عظیم شاعر کی شخصیت کی آئینہ داری کرتے ہیں اور ان کی اہمیت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

"اقبال اور شاد" کے مکاتیب کو سات حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاد سے

پہلی ملاقات مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوئی تھی اور اس کے بعد سے دونوں میں خلوص محبت کا جو رشتہ قائم ہوا وہ اقبال کی وفات تک استوار رہا۔ پہلی ہی ملاقات میں اقبال کشن پرشاد کی شخصیت، ان کے بلند حوصلے، علمی وقار اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے تھے اور حیدر آباد سے واپس آکر انھوں نے شاد کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا وہ اسی اثر پذیری کی یادگار ہے وہ کہتے ہیں ؎

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر — بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت — آسماں اس آستانے کی ہے اک فوجِ غبار
کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری — چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے ہیں نثار
نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا — محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار
شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے — مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاد کی شخصیت کا کیسا گہرا نقش اقبال کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوا تھا۔ یہ وہی اقبال تھے جنھوں نے سر اکبر حیدری وزیر اعظم ریاست حیدر آباد کے یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانے سے ہزار روپے کا چیک بھیجنے پر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کتاب کے مطالعے سے کشن پرشاد کی افتاد طبع اور ان کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے اپنے ایک خط میں اقبال کو لکھتے ہیں:

> اگرچہ میں جس قدر مختار ہوں اس سے زیادہ مجبور ہوں جس قدر آزاد ہوں اس سے زیادہ پابند جس قدر بلند ہوں اس سے زیادہ پست، مگر الحمد للہ کہ فقیر منش سپاہی زادہ ہوں۔ مصیبت کا مقابلہ کرنا میرا حقیقی جوہر ہمت کا نہ ہارنا میرا اصلی دھرم ہے"

جنوری ۱۹۲۹ء میں اقبال دوسری مرتبہ وارد حیدر آباد ہوئے اس وقت اقبال

کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کے لکچر کا انتظام کیا گیا تھا اور شاد نے اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرے اور دعوت کا اہتمام کیا تھا

اقبال اور شاد کے خطوط سے ادبی دنیا کے بعض پوشیدہ راز بھی ہم پر منکشف ہوتے ہیں۔ شاد نے حیدرآباد میں جوش کا تقرر اقبال ہی کی سفارش پر کیا تھا۔ اقبال نے جوش کی سفارش کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

"یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی معرفی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظر عنایت فرمائیں گے اور ان کو کسی امر میں سرکار عالی کے مشورے کی ضرورت ہوئی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ سرکار والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی ہے۔"

ڈاکٹر زور ان خطوط کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"یہ خطوط خود اپنی تفسیر ہیں ان کے مطالعے سے ہندوستان کے دو بڑے انسانوں کے قلبی و ذہنی رجحانات بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ ان میں ان کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کی گہرائیاں آئینے کی طرح صاف و شفاف نظر آتی ہیں۔ یہ خطوط اس حقیقت حال پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں کہ دوستی و محبت کو نبھانے اور اس میں ترقی دینے کے لیے قلب و دماغ کی کیسی وسعتیں درکار ہیں اور دو انسان وطن مذہب اور مرتبے کی وسیع سے وسیع تر خلیجوں اور اختلافات کے باوجود کیونکر ایک دوسرے کے رنج و راحت کے شریک اور کمالات کے معترف رہ سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر زور ۲۵ اگست ۱۹۲۷ء کو حیدرآباد سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے اور بمبئی سے انھیں جہاز میں سفر کرنا تھا۔ بمبئی میں انھیں کچھ دن قیام کرنا پڑا تھا اور قیام بمبئی کے دوران انھوں نے اپنی نامکمل کتاب "محمود غزنوی کی بزم ادب" مکمل کی تھی اور اشاعت کے لیے مسودہ حیدرآباد روانہ کیا تھا۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی اردو کے ایک خوش گو شاعر تھے اور اپنے مخصوص طرزِ ادا کی وجہ سے انھوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا تھا۔ شاد عظیم آبادی کے خطوط کو ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۹ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شائع کر کے ان کی شخصیت اور شاعری پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ خطوط شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ رسمی تحریروں میں شاعر یا مصنف کی شخصیت پوری طرح بے نقاب نہیں ہونے پاتی لیکن مکاتیب دلی جذبات اور شخصی تصورات کے ترجمان ہوتے ہیں اور ان میں ہمیں شاعر اور مصنف کی ذات اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ مکتوبات بھی تحقیق میں اہم ماخذ ثابت ہوتے ہیں اور ان سے بعض وقت اہم داخلی شہادتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ خود شاعر کا بیان دوسرے ماخذوں سے زیادہ مستند اور قابل اعتبار ہوتا ہے۔ سلیمان ندوی نے شاد عظیم آبادی کے کلام کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔

"مکتوبات شاد عظیم آبادی" میں ۳ جولائی ۱۸۹۶ء سے ۱۸ دسمبر ۱۹۲۶ء یعنی تیس سال کے عرصے میں لکھے ہوئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کی تعداد ارسٹھ ۶۸ ہے اور یہ حیدرآباد کی ایک مشہور شخصیت بیرسٹر ہمایوں مرزا اور ان کی بیگم صغرا ہمایوں مرزا کے نام لکھے گئے ہیں۔ صغرا ہمایوں مرزا حیدرآباد کی نسوانی دنیا میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب ریاست حیدرآباد کی خواتین ذہنی، تعلیمی اور سماجی اعتبار سے بہت پس ماندہ تھیں۔ بیگم ہمایوں مرزا نے ان کی تعلیم و تربیت، ذہنی ترقی اور

بیداری کے منصوبے بنائے۔ وہ خود شاعرہ اور مصنفہ تھیں۔ اپنی تقریر و تحریر اور سماجی فلاح و بہبود کے کاموں سے انھوں نے طبقۂ اناث کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی اس لیے اکثر اپنے خطوط میں شاد عظیم آبادی نے انھیں "سرتاج خاتونانِ ہند" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط ڈاکٹر زور نے تاریخ وار مرتب کیے ہیں تاکہ زمانی و تاریخی ترتیب میں شاد کے خطوط کا مطالعہ کر کے اُن کے واقعاتِ زندگی اور تصورات کو وقت کے آئینے میں دیکھا جا سکے۔ ابتدا میں ڈاکٹر زور نے ایک پُر مغز مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں شاد عظیم آبادی کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے مکتوبات کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ شاد عظیم آبادی اپنے عہد کے ایک مقبول اور ہر دل عزیز شاعر تھے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے اپنے ہمعصر شعرا اور مشہور ادبی شخصیتوں کا بڑے پُرلطف انداز میں ذکر کیا ہے، ان خطوط سے شاد کے مختلف واقعاتِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شاد عظیم آبادی نے ایک مولود آصف سابع میر عثمان علی خان کے دربار میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کا مقصد مالی منفعت ہوگا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے بڑی سادگی اور راست گفتاری سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ سر سید احمد خان کے اصرار پر انھوں نے یہ مولود دینے سے محض اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ اسے نظام حکومت کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ علی گڈھ کے جلسے کا حال شاد نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

"آخر میں علی گڑھ پہنچا۔ کالج میں یہ صحبت ۴ ر دسمبر کو قرار دی گئی ایک ہزار سے زائد سامعین تھے۔ پچیس انگریز مثل مسٹر بک صاحب و مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر کے جمع تھے۔ چھ بجے شام سے ساڑھے نو بجے تک کھڑے ہو کر میں نے مولود پڑھا۔ میں عرض نہیں کر سکتا کہ سامعین کا کیا حال تھا ایک بی۔ اے کے لڑکے کو غش آ گیا بعد اتمام ایک گھنٹے تک برابر مولوی شبلی صاحب، مولوی حالی صاحب، سر سید احمد صاحب اور مسٹر آرنلڈ صاحب نے اس کی تعریف میں

اسپیچیں (Speechs) کیں۔ ہر چند چاہا کہ مولود چھاپنے کے لیے دیدوں چونکہ میرا اس وقت یہ خیال تھا کہ مولود ہذا حضور نظام کی خدمت میں نذر کروں گا نہ دیا۔"

ان خطوط میں معلومات کے خزانے پوشیدہ ہیں اور ان کے مطالعے سے عہد گزشتہ کی ادبی صحبتوں کا نقشہ نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ میر نفیس کی دعوت اور ایک مجلس میں اپنے مرثیہ سنانے کا حال بھی شاد نے بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ شاد بحیثیت مرثیہ گو اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں انھوں نے بہت سے طویل مرثیے کہے ہیں۔ زبان پر قدرت اور جذبات نگاری کے اعتبار سے بھی ان مرثیوں کی اہمیت مسلّمہ ہے۔

شاد کے بعض خط بہت طویل ہیں یعنی بیس بیس صفحات پر محیط نظر آتے ہیں۔ ان میں کہیں عظیم آباد کے ادبی مرکزوں کا ذکر ہے تو کہیں لکھنؤ کی شعری نشستوں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے نامور مرثیہ نگاروں کے بارے میں شاد نے بعض ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ شاد عظیم آبادی کے کم و بیش تمام خطوط میں اُن کی شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اُن کی افتادِ طبع اور مزاج کو سمجھنے میں یہ خطوط ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی کے اپنی ذات اور شخصیت سے متعلق طویل بیانات میں خود پسندی اور خودنمائی کی جھلک نظر آتی ہے اس سے قطع نظر یہ خطوط ان محققین کے لیے نعمتِ عظمیٰ کا درجہ رکھتے ہیں جو شاد عظیم آبادی کی شخصیت اور ان کے فن پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔

"گارساں دتاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اردو" پہلی بار ۱۹۳۱ء میں اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی اور پھر دس سال بعد ۱۹۴۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ ابتدا میں گارساں دتاسی کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے گئے ہیں اور اردو سے اس کے غیر معمولی شغف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے گارساں دتاسی کی ادبی خدمات

کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے ان کا خیال ہے کہ دیوانِ ولی کی تدوین اس کا سب سے اہم ادبی کارنامہ ہے۔ گارساں دتاسی نے تین سال کی لگاتار مشقت اور تلاش و جستجو کے بعد دیوانِ ولی مرتب کیا۔ اس کے متعدد نسخے ہندوستان سے منگوائے اور ان کا تقابل کر کے ۱۸۳۴ء میں اسے پیرس کے شاہی دار الطبع سے شائع کروایا تھا۔ گارساں دتاسی نے اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۳۵ء میں "مثنوی کامروپ" کا فرانسیسی ترجمہ مکمل کر لیا تھا۔ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" ۱۸۳۹ء میں طبع کروائی۔ یہ کتاب "رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ" کے سلسلہ مطبوعات میں شریک تھی۔ یہ تاریخ یورپی زبانوں میں اپنے موضوع کے لحاظ سے اولین تصانیف میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ دتاسی نے "منطق الطیر" "مثنوی اژدر نامہ"، "مقدمہ گل بکاؤلی" اور "مرثیہ مسکین" کو فرانسیسی میں بڑے سلیقے اور ادبی ذکاوت کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ "اخوان الصفا" اور "آثار الصنادید" کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ دتاسی کی ادبی خدمات کا ڈاکٹر زور نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی زبان سے واقفیت نے بھی ڈاکٹر زور کو دتاسی کی تصانیف کو سمجھنے اور ان سے محظوظ ہونے میں مدد دی تھی۔ دتاسی کے علاوہ دیگر بہی خواہانِ اردو میں ڈاکٹر زور نے آرنٹ اسپرنگر، ہنرو بروٹن ہیمرجے پرنسپ، ٹرڈیر اور ٹیلر روبک وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں اور ان کی ادبی خدمات کو متعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر زور کی اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے پرستار دور دراز ممالک میں بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر زور نے ساہتیہ اکیڈمی کی فرمائش پر "اردو شاعری کا انتخاب" ۱۹۶۰ء میں مرتب کیا تھا۔ اس انتخاب میں ہر دور کے نمایندہ شعراء کا کلام پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ مرتب نے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔ ڈیڑھ سو شعراء کا یہ انتخاب ۱۷۵۰ء سے لے کر

موجودہ دور تک یعنی پانچ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ کتاب کے بارے میں ڈاکٹر زور نے دیباچے میں لکھا ہے کہ اردو کا شاعر خواہ اس کا تعلق ملک کے کسی علاقے سے ہو ایک مشترکہ تہذیب کا پروردہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہر شاعر کے عہد کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے حالات زندگی مختصراً بیان کیے ہیں۔ قدیم شعرا میں صرف اشرف، شیخ خوب محمد چشتی، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ شاہی، طبعی، ابوالحسن تاناشاہ اور ولی اورنگ آبادی کو شامل کیا ہے دور متوسط اور عصر حاضر کے شعرا کے کلام کا اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے لیکن جدید دور کے بعض شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں "اعتذار" کے زیر عنوان مرتب نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر چند نامور شعرا کا کلام اس انتخاب میں شامل نہیں ہو سکا ہے۔ اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ وارثی، سید جلال الدین توفیق، جلیل مانک پوری، اقبال، حسرت موہانی، چکبست، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی، عظمت اللہ خان، اختر شیرانی، کیفی اعظمی، میراجی اور ن۔ م راشد جیسے اہم شعراء کے کلام کو اس انتخاب میں جگہ نہیں مل سکی ہے اس لیے ہم اسے اردو شعرا کا نمایندہ انتخاب نہیں کہہ سکتے۔ ڈاکٹر زور کی اس کتاب پر بعض حلقوں سے سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔

"تذکرہ نوادر ایوان اردو" جلد اول میں ایوان اردو کے مخزونہ فرامین، قطعات، تصاویر، اسلحہ، البموں، آرٹ گیلری کے مختلف شعبوں، مشاہیر کے مکاتیب اور دیگر تہذیبی آثار کا تعارف کروایا گیا ہے۔ اور ان کے متعلق مفید معلومات درج کی گئی ہیں جنوبی ہند میں اردو کے اس اہم مرکز کے نوادرات کا تعارف دو سو بیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مطالعے سے ڈاکٹر زور کی ہمہ گیر اور وسیع معلومات، ان کی تاریخ دانی اور ان کے ثقافتی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ تذکرہ

ایک قیمتی تحفہ ہے۔

"نذر محمد قلی قطب شاہ" ۱۹۵۸ء میں ادارہ ادبیات اُردو سے شائع ہوا۔ اسے ڈاکٹر زور نے مرتب کیا ہے۔ اس میں محمد قلی قطب شاہ کے واقعات زندگی، ادبی و ثقافتی خدمات اور اس کی شخصیت اور عہد سے متعلق ملک کے نامور اہل قلم کے مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں جو یادگار "یوم محمد قلی" منایا گیا تھا اس کی تقاریر اور مختلف اجلاسوں کی رپورٹ کے علاوہ محمد قلی اور قطب شاہی عہد کی تاریخ ساز شخصیتوں کی تصاویر بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ "نذر محمد قلی قطب شاہ" میں جو مختلف مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں ان سے نہ صرف اس شاعر کے عہد اور اس کی شخصیت و شاعری پر روشنی پڑتی ہے بلکہ دوسرے قطب شاہی سلاطین اور ان کے عہد کے تمدنی رجحانات اور تاریخی آثار سے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔ حیدر آباد کے شعرا نے بانی شہر حیدر آباد پر جو نظمیں یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر کہی تھیں انھیں بھی اس یادگار نمبر کی زینت بنایا گیا ہے۔